قلعہ جنگی اور خس وخاشاک زمانے پر 9/11 کے اثرات

مقالہ برائے ایم ایس اردو

۲۰۱۵:۲۰۱۷

محقق:

محمد سہیل اقبال

رجسٹریشن نمبر: 161-FLL/MSURDU/F15

نگران:

ڈاکٹر سید کامران عباس کاظمی

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اُردو

شعبہ اردو

کلیہ زبان وادب

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

International Islamic University Islamabad

Accession No. TH-19722

MS.
891.439
اق ق

قلعہ جنگی اور خس خاشاک زمانے پر 9/11 کے اثرات

مقالہ نگار:

محمد سہیل اقبال

رجسٹریشن نمبر: 161-FLL/MSURDU/F15

مقالہ برائے ایم ایس (اُردو)

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

یہ مقالہ

ایم ایس (اُردو)

کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے لیے پیش کیا گیا

کلیۂ زبان وادب

شعبہ اُردو

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

۲۰۱۸ء

مقالے کے دفاع اور منظوری کا فارم

درج ذیل مقالہ شعبۂ اُردو، کلیہ زبان و ادب، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی میں MS اُردو کی ڈگری کی جزوی منظوری کے لیے پیش کیا گیا ہے۔ زیرِ دستخطی نے یہ مقالہ پڑھا اور مقالے کے دفاع کو جانچا ہے اور MS اُردو کی ڈگری تفویض کرنے کی منظوری دیتے ہیں۔

مقالے کا عنوان: **قلعہ جنگی اور خس و خاشاک زمانے پر 9/11 کے اثرات**

مقالہ نگار: محمد سہیل اقبال

رجسٹریشن نمبر: 161-FLL/MSURDU/F15

کمیٹی دفاع مقالہ

پروفیسر ڈاکٹر منور اقبال احمد
ڈین
کلیہ زبان و ادب

ڈاکٹر عزیز ابن الحسن
چیئرمین
شعبۂ اُردو

ڈاکٹر فوزیہ اسلم
اسسٹنٹ پروفیسر (اُردو)
نمل، اسلام آباد
بیرونی ممتحن

ڈاکٹر عزیز ابن الحسن
ایسوسی ایٹ پروفیسر (اُردو)
آئی آئی یو، اسلام آباد
اندرونی ممتحن

ڈاکٹر کامران عباس کاظمی
اسسٹنٹ پروفیسر (اُردو)
آئی آئی یو، اسلام آباد
نگران مقالہ

مئی، 2018ء

فہرست ابواب

صفحہ نمبر	تفصیل
۳	پیش لفظ
۶	**باب اول:** اردو ادب اور 9/11: اجمالی جائزہ
۳۹	**باب دوم:** قلعہ جنگی اور خس و خاشاک زمانے کا تعارفی مطالعہ
۸۰	**باب سوم:** قلعہ جنگی اور خس وخاشاک زمانے کے پلاٹ اور تکنیک پر 9/11 کے اثرات
۱۲۲	**باب چہارم:** قلعہ جنگی اور خس وخاشاک زمانے میں کرداروں کے شخصی ارتقاء پر 9/11 کے اثرات
۱۵۶	**باب پنجم:** قلعہ جنگی اور خس وخاشاک زمانے میں سیاسی علائم واستعارات کا استعمال
۱۸۳	مجموعی جائزہ وسفارشات
۱۸۹	کتابیات

اقرار نامہ

میں، محمد سہیل اقبال حلفیہ بیان کرتا ہوں کہ اس مقالے میں پیش کیا گیا کام میرا ذاتی ہے اور بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی ،اسلام آباد کے ایم ایس(اُردو) سکالر کی حیثیت سے ڈاکٹر کامران عباس کاظمی کی نگرانی میں مکمل کیا ہے۔ میں نے یہ کام کسی اور یونیورسٹی یا ادارے میں ڈگری کے حصول کے لیے پیش نہیں کیا اور نہ آئندہ کروں گا اور میرا یہ مقالہ سرقہ سے پاک ہے۔

(محمد سہیل اقبال)

مقالہ نگار

شعبہ اُردو

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

۲۰۱۸ء

پیش لفظ

سانحہ 9/11 کا تذکرہ سب سے پہلے میں نے اپنے استادِ محترم ماجد وحید بھٹی سے سنا تھا، جو ان دنوں گورنمنٹ ڈگری کالج اٹک میں سیاسیات کے پروفیسر تھے۔ اپنے لیکچر کے آخری دس منٹ جو سوال و جواب کے لیے مختص ہوتے تھے، میں انہوں نے بتایا کہ امریکہ میں 110 منزلہ عمارت کو جہازوں سے ٹکرایا کر تباہ کر دیا ہے، اور ایک جہاز پینٹا گان سے بھی ٹکرایا ہے۔ ہمیں بتایا گیا تھا کہ اس سانحہ کے اثرات بہت شدید ہوں گے۔ خصوصاً پاکستان پر اس کے برے اثرات مرتب ہوں گے، یہ ان کی سیاسی بصیرت کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ لیکن اس وقت میں ان کی شدید اثرات والی بات کو نہ سمجھ سکا کہ کیا اثرات مرتب ہو سکتے ہیں۔

اس کے بعد میں مسلسل اخباروں میں سانحہ 9/11 کے حوالے سے کالم پڑھتا رہا، روزانہ ٹی وی پر خبریں بھی سنتا رہا، لیکن اس سب کے باوجود مجھے کوئی خاص بات پتا نہ چل سکی۔ اس کے بہت سال بعد ۲۰۱۵ء میں جب میرا بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی میں داخلہ ہوا تو مجھے پروفیسر ڈاکٹر نجیبہ عارف کی کتاب 9/11 اور پاکستانی اردو افسانہ کا مطالعہ کا موقع ملا جو عملی تنقید کی عمدہ کتاب ہے۔ اس کے بعد میں نے اپنے نگران ڈاکٹر سید کامران عباس کاظمی سے صلاح و مشورہ کے بعد مستنصر حسین تارڑ کے ناولوں پر 9/11 کے اثرات کو اپنا تحقیقی موضوع منتخب کیا۔

میں نے اردو ادب پر 9/11 کے اثرات کے مطالعہ کیا، خصوصاً اردو شاعری، افسانہ اور ناول کو بطورِ خاص موضوع بنایا۔ لیکن تحقیق کے لیے یہ مطالعہ کم تھا، اس کمی کو پورا کرنے کے لیے میں نے عالمی سطح کے دانشوروں کی نگارشات کا بھی مطالعہ شروع کر دیا جن میں فوکو یاما کی *The End of Histoery*، سموئل پی ہنٹنگٹن کی *The Clash of Civilizations*، پروفیسر ڈاکٹر مجاہد کامران کی کتاب *9/11&New World Order*، ارون دھتی رائے کی کتاب سرمایہ داریت ریاستی جبر اور مزاحمت جس کا ترجمہ نذیر امجد نے کیا ہے، ثروت جمال اصمعی کی کتاب دہشت گردی اور مسلمان، اور اے کنول کی کتاب *Rethinking Identities in Contemporary Pakistani Fiction Beyand 9/11*، کو خاص مدِ نظر رکھا۔

اگلہ مرحلہ اپنے موضوع کا بورڈ آف سٹڈی کی میٹنگ میں دفاع کرنا تھا۔ موضوع میں دلچسپی کو جانچنے

کے لیے پروفیسر ڈاکٹر نجیبہ عارف نے بڑے ہی مشکل سوالات کیے اور اپنی ہدایات کی روشنی میں اس مقالہ کی ابواب بندی میں اہم کردار ادا کیا۔ اگلہ مرحلہ بورڈ آف فیکلٹی کی میٹنگ کا تھا جو بہت اہم ہوتا ہے میں میڈم نجیبہ عارف کا بہت ممنون ہوں جنہوں نے اس موضوع کو منظور کرانے میں اپنا کلیدی کردار ادا کیا۔

موضوع کے انتخاب سے لے کر مقالہ کی تکمیل تک میرے نگران ڈاکٹر سید کامران عباس کاظمی کی ہر لمحے اور ہر مشکل گھڑی میں میری مدد کی جس کا میں تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔ بھائی راشد اقبال کا بھی شکریہ ادا کرنا ضروری ہے جس نے اہم کتب فراہم کیں۔ والدین کا شکریہ بھی لازم جو میری مشکل کشائی کے لیے ہر وقت دعا گو رہتے ہیں۔

مقالہ کا پہلا باب ''اردو ادب اور 9/11: اجمالی جائزہ'' ہے جس میں شاعروں ،افسانہ نگاروں اور ناول نگاروں کی تخلیقی تحریروں کا جائزہ لیا گیا ہے ۔شاعروں میں غلام حسین، اقبال شمیم، ثروت زہرا، ذی شان ساحل، احمد ندیم قاسمی اور حسین مجروح قابلِ ذکر ہیں۔ غلام حسین ساجد کی نظم ''ڈیزی کٹر'' میں ڈرون حملے کی تباہی اور ہولنا کی کو بیان کیا ہے۔اقبال شمیم کی نظم ''گیارہ ستمبر'' میں بے گناہ لوگوں کی موت پر افسوس کیا ہے۔ثروت زہرا کی نظم ''ایک اور فتح کے بعد'' میں تباہی کے بعد پھر سے ایک نیاء جہاں آباد کرنے کی خواہش پر مشتمل ہے۔اس کے علاوہ جن نظموں میں گیارہ ستمبر کے موضوع کا تخلیقی اظہار کیا ہے ان میں ذی شان ساحل کی نظم ''ہمارے پاس'' احمد ندیم قاسمی کی نظم ''عراقی عوام کا نوحہ'' اس کے علاوہ حسین مجروح کی نظم ''مرجینا کی واپسی'' بہت اہم ہے۔ جن افسانہ نگاروں نے گیارہ ستمبر کو اپنا تخلیقی موضوع بنایا ہے ان میں افتخار نسیم، علی حیدر ملک، الطاف فاطمہ، انور زاہدی، مسعود مفتی، منشایاد، مصطفیٰ کریم، نیلوفر، مبین مرزا، زاہدہ حنا، پرویز انجم، محمد حمید شاہد، اور محسنہ گیلانی قابلِ ذکر ہیں۔ناول نگاروں میں مستنصر حسین تارڑ، محسنہ جیلانی، یونس جاوید، سرفراز بیگ، ایم اختر، اور مرزا اطہر بیگ اہم ہیں۔ باب دوئم میں قلعہ جنگی اور خس و خاشاک زمانے کا تفصیلی تعارفی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ باب سوئم میں قلعہ جنگی اور خس و خاشاک زمانے کے پلاٹ اور تکنیک پر 9/11 کے اثرات کا مطالعہ پیش کیا ہے۔ باب چہارم میں قلعہ جنگی اور خس و خاشاک زمانے میں کرداروں کے شخصی ارتقاء کو مدِ نظر رکھا ہے۔ باب پنجم میں قلعہ جنگی اور خس و خاشاک زمانے میں سیاسی علائم و استعارات کے استعمال کا جائزہ لیا گیا ہے اور مجموعی جائزہ و سفارشات کو بیان کیا

ہے۔

آخر میں ایک مرتبہ پھر میں اپنے نگران ڈاکٹر سید کامران عباس کاظمی، اساتذہ کرام، ڈاکٹر عزیز ابن الحسن، ڈاکٹر ارشد معراج اور ڈاکٹر نجیبہ عارف کا بہت شکر گزار ہوں جنہوں نے مقالے کی تکمیل تک ہر ممکن مدد کی۔

سہیل اقبال

ایم ایس سکالر

باب اول

اُردو ادب اور 9/11: اجمالی جائزہ

نوّے کی دہائی میں جب دنیا سے سرد جنگ کے خاتمہ کا اعلان ہوا تو قوموں نے اس کو سیاسی طور پر آخری تبدیلی سمجھا اور یہ خیال عام ہوتا گیا کہ شاید اب دنیا میں کوئی بڑی جنگ ،انقلاب، یا ڈرامائی تبدیلی نہ ہو فرانسز فوکو یاما نے بھی اسی خیال کو تقویت دی اور اس پر ایک مربوط اور جامع کتاب *The End of History and the Last Man* یعنی تاریخ کا خاتمہ اور آخری آدمی لکھی، جس میں انہوں نے ''لبرل جمہوریت'' کو انسانی نظریاتی ارتقاء کا آخری نکتہ قرار دیا۔فرانسز فوکو یاما لکھتے ہیں

> تاریخ کے خاتمے کے معنی یہ ہوں گے کہ جنگیں اور خونی انقلابات ختم ہو گئے۔مقاصد پر اتفاق کی وجہ سے انسانوں کے بعد ایسے بڑے اسباب نہیں ہوں گے جن کے لیے جنگ کی جائے لوگ اپنی ضروریات معاشی سرگرمیوں کے ذریعے پوری کریں گے۔انہیں لڑائیوں میں اپنی جانوں کو خطروں میں ڈالنے کی ضرورت نہیں ہوگی۔(۱)

لیکن دنیا میں اس کے بعد بھی خونی انقلاب اور جنگیں ہوتی رہیں۔کیونکہ کے تاریخ کے خاتمہ کے لیے لبرل جمہوریت کا ہونا ہی کافی نہیں ہے۔اس کے ساتھ آزادی اور معاشی مساوات کا ہونا بھی بہت ضروری ہے۔

نوّے کی دہائی میں ہی سیموئل پی ہنٹنگٹن کی مشہور کتاب *The Clash of Civilizations* منظرِ عام پر آئی ،جس میں فرانسز فوکو یاما کے نظریہ کے مخالف نظریہ بیان کیا گیا کہ اب دنیا میں جو جنگیں ہوں گی وہ مذہب، فرقہ واریت ،قومیت ،اور تہذیبوں کی بنیاد پر ہوں گی ،اور دنیا کے صرف چند بڑے ممالک ہی بڑی تہذیبوں کی بنیاد پر محفوظ رہیں گے۔ہنٹنگٹن بیان کرتے ہیں۔

> Cold war world derives -.....A third map of the post from what is often called the realist theory of international relations.According to this theory, states are the primary, indeed, the only important actors in world affairs,the relation among states is one of the anarchy,and hence to insure their survival attemt to maximize and security,states invariably their power.If one state sees another state increasing its power and thereby becoming a potential threat, It attemts to protect irs own security by strengthening its power and or by allying itself with other states. The interests and

actions of the more or less 184 cold war world can be predicted-states of the post from these assumptions (2)

سرد جنگ کے خاتمہ کے بعد ہی دنیا میں تہذیبوں کی بنیاد پر جنگیں استوار ہونے کے تانے بانے تیار ہونے لگے۔ 9/11 کا سانحہ ایسے ہی تمام واقعات کی مربوط کڑی دکھائی دیتا ہے۔ان واقعات کے سلسلے کو دیکھتے ہوئے جان کے کولی نے اپنی کتاب *Unholy War* غیر مقدس جنگیں میں کسی حد تک 9/11 کے سانحہ کی پیشن گوئی کردی تھی۔جان کے کولی اس ساری داستان کو یوں بیان کرتے ہیں

> اپنی لاعلمی کا احساس کم کرنے کے لیے میں جیمس مچز کا افغانستان کے پس منظر میں لکھا ناول ''کاروان'' دوبارہ پڑھنے لگا۔اسے پڑھتے ہوئے نجانے کیوں مجھے اس سرزمین کے متعلق خوف وخدشات نے گھیر لیا۔میں نے اس ملک افغانستان میں، چند گھنٹوں کے لیے ایک مختصر سا سفر کیا تھا۔پھر بھی میں خود کو اس کے بارے میں سوچنے اور سوچتے رہنے پر مجبور پاتا تھا۔مجھے کیا خبر تھی کہ یہ پہاڑی علاقہ جہاں کبھی زارِروس اور برطانوی سامراج نے اپنی ''گریٹ گیم'' کھیلی تھی ،ایک مرتبہ پھر سوویت روس اور امریکہ کے درمیان سرد جنگ کا میدان بن جائے گا۔جدید خطوط پر استوار ہوتا ہوا یہ روایتی مشرقی شہر تشدد اور ہلاکت کا مرکز کہلائے گا۔یہاں سے انتہا پسندی کی لہر پھوٹے گی جو مشرق ومغرب دونوں جانب پھیلے گی۔آخر کار سوویت یونین ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا اور مغربی معاشرے اور حکومتیں دہشت گردوں کا ہدف قرار پائیں گی(۳)

جان کے کولی کے خدشات درست ثابت ہوئے اور 11 ستمبر 2001ء میں وقوع پذیر ہونے والے سانحہ نے انسانی تاریخ کے دھارے کو بالکل ایک نئی سمت کی طرف موڑ دیا۔لیکن عالمی امور پر گہری نظر رکھنے والے دانشوروں نے 9/11 کے پسِ پردہ عالمی سیاست کے مخفی حقائق کو بیان کیا۔پروفیسر ڈاکٹر مجاہد کامران اپنی کتاب *9/11 and The New World Order* میں بیان کرتے ہیں

> عوامی ذہنوں کی طنابیں کھینچنا ہی اُس اشرافیہ (The Elite) کی حکمت عملی کا

> سب سے ضروری جز ہے جس کی بناء پر وہ نئے ''عالمی نظام'' کا قیام عمل میں لانا چاہتے ہیں۔ انہی طنابوں کے کھینچے جانے سے ان کے لیے اپنے عزام کو چھپانااور اپنے کنٹرول کو خاموشی اور بے رحمی سے بڑھانا ممکن ہو سکے گا۔اسی طور پیدا ہونے والے کنٹر ولڈ اور سبک دست (Manipulated)اندازِفکر و ذہنی رجحان کے ذریعے عوام کو قابو کرنے کی خاطر یہ اشرافیہ(The Elite) سائنس دانوں اور تحقیق کاروں کی سر پرستی اور انہیں رقوم فراہم کرتا ہے۔محض عوام کو دھوکہ دے کر ہی یہ اشرافیہ (The Elite)اس کرہ ارض پر قبضہ جمانے اور یہاں حکومت کرنے کے لیے اپنی کارروائیاں سرانجام دیتا ہے۔ان اشرافیہ(The Elite)کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ یہ ہمیشہ بنی نوع انسان کی بڑی اکثریت کو دھوکہ دینے میں کامیاب وکامران رہے ہیں۔(۴)

سانحہ 9/11 کے واقعہ کو جس بہادری اور دیدہ دلیری سے ارون دھتی رائے نے بے نقاب کیا ہے، وہ اپنی مثال آپ ہے۔ارون دھتی رائے بیان کرتی ہیں۔

> گیارہ ستمبر 2001ء کے بعد جس طرح کی سیاسی نعرہ بازی اور بیان بازی کا بازار گرم ہوا تو میرا خیال تھا کہ یہ محض احمقانہ اور خود پسندانہ نعرے بازی کے سوا کچھ نہیں ہے لیکن میرا یہ خیال غلط ثابت ہوا۔وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مجھ پر یہ حقیقت اِفشاء ہوگئی کہ دراصل یہ ایک بے بنیاد اور خطرناک جنگ کے لیے راستہ ہموار کرنے کی سازش ہے۔آئے دن مجھے اس بات پر حیرت ہوتی کہ کتنے ہی لوگ ایسے ہیں جن کا خیال ہے کہ افغانستان جنگ کی مخالفت کرنا ،دہشت گردی یا طالبان کی حمایت کرنے کے مترادف ہے۔۔۔۔(۵)

سانحہ 9/11 کے ہمہ گیر عالمی اثرات کی وجہ سے پاکستان سب سے زیادہ متاثر ہوا۔سانحہ 9/11 نے پاکستان کی سیاست ،معیشت،اور طرزِ فکر کو بڑی حد تک متاثر کیا،کیونکہ اس سانحہ کے فوراً بعد امریکہ کی طرف سے پاکستان کو دہشت گردی کا محور قرار دیا جانے لگا،اور اس وقت کے فوجی حکمران جنرل پرویز مشرف کو براہ

راست فون پر دھمکی دے کر امریکہ کا ساتھ دینے کو کہا۔ حالانکہ ورلڈ ٹریڈ سنٹر پر حملہ کرنے والوں ملزموں میں سے کوئی بھی پاکستانی نہ تھا۔ لیکن اس سب کے باوجود پاکستان کو اس کے نتائج بھگتنا پڑے۔

پاکستان میں سیاسی پالیسیوں کی وجہ سے حالات اور زیادہ دگرگوں ہوگئے۔ پاکستانی حکومت کو اپنی ہی سر زمین اور اپنے کئی اداروں کے خلاف آپریشن کرنے پڑے، جس کے نتیجے میں پاکستان میں دہشت گردی روز کا معمول بن گئی، ملک میں بم دھماکوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہوگیا، جس میں پاکستان کے کئی ہزار شہری شہید ہوگئے، سکول، کالج، اور یونیورسٹیوں کو نشانہ بنایا گیا۔ ان سب اثرات کو مختلف مکتبہ فکر سے تعلق رکھنے والوں نے اپنے اپنے نقطہ نظر سے دیکھا اور بیان کیا ہے۔ مابعد 9/11 کی نامعلوم حدود و قیود پر بات کرتے ہوئے نجیبہ عارف اپنی کتاب 9/11 اور پاکستانی اردو افسانہ میں بیان کرتی ہیں

> مابعد کی اس دنیا میں دو بلند و بالا عمارتوں کا گرنا، دراصل دو خلاوں کی تشکیل ہے۔ ایسی تخریب جس کی بنیاد پر نئی تعمیر ہوسکتی ہے۔ یہ واقعہ ایک عہد کی فصیل اور دوسرے عہد کا دروازہ ہے۔ یہ بات بش اور اوباما کی تقاریر سے لے کر، اسکول کے بچوں کے مباحث تک کئی بار کہی اور سنی گئی ہے کہ گیارہ ستمبر کا دن عہدِ جدید کی تاریخ کا اہم ترین دن ہے، جب پرانی جمی جمائی زندگی کی بساط الٹ گئی اور مشرق و مغرب کے درمیان ایک نیا رشتہ استوار ہوا۔ اس الٹی ہوئی بساط کو اس نئے رشتے کے پیچ و خم کو، ہر ایک نے اپنے اپنے فکری، تاریخی، اور واقعاتی تناظر میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔(٦)

سانحہ 9/11 کو وقوع پذیر ہوئے سولہ برس بیت چکے ہیں، لیکن اس کے اثرات ابھی تک قائم ہیں۔ جس طرح 9/11 کے واقعہ نے زندگی کے دوسرے تمام شعبہ ہائے زندگی پر اثرات مرتب کیے ہیں، اسی طرح عالمی ادب پر بھی اس کے نمایاں اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ خود امریکہ میں بھی اس حوالے سے کئی ادبی تخلیقات منظرِ عام پر آئی ہیں۔ ایک سے زائد انگریزی ناول لکھے گئے ہیں، جن میں Don Delillo کا انعام یافتہ ناول *The Falling Man* بہت نمایاں ہے۔ اس فالنگ مین کا تذکرہ مستنصر حسین تارڑ نے اپنے دلچسپ ناول خس و خاشاک زمانے میں بڑے ہی دلچسپ انداز سے پیش کیا ہے۔ اس کے علاوہ

John ،*Pattern Recognition* کا William Gibson،*Netherland* کا O,Neill Updike کا *Terrorist*،مشہور پاکستانی انگریزی ناول نگار محسن حمید کا ناول *The Reluctant* اور *Fundamentalist*،نمایاں ہیں جن پر 9/11 کے واضح اثرات کو بیان کیا گیا ہے،اور بتایا گیا ہے کہ عالمی انقلابات،جنگیں،اور سازشیں کس طرح عام انسانوں کی زندگی کو متاثر کرتے ہیں اور کس طرح ذہنی رویے تشکیل پاتے ہیں۔

اُردو ادب پر بھی سانحہ 9/11 نے گہرے اثرات مرتب کیے ہیں ۔اُردو ادب اپنے تمام ادوار کے سیاسی ،معاشی ،مذہبی،اور ملکی مسائل کا آئینہ دار رہا ہے ۔گیارہ ستمبر کے نہ ختم ہونے والے جبر و استحصال کے اثرات کو اردو فکشن اور شاعری دونوں میں بھر پور انداز سے پیش کیا گیا ہے۔ عالمی سیاست کے ادارے،عالمی کردار،عالمی سازشیں،دہشت گردی،بم دھماکے،غیر یقینی صورتِ حال،فوجی آپریشنز،انسانوں کو زندہ در گور کرنے کی مہم،حکومتوں کی تبدیلیاں،آمروں کی پالیسیاں،مزاحمتی رویے،نفرتیں،تعصب،فرقہ واریت،مغرب کی اسلامی ملکوں پر چڑھائی،،بے بنیاد جنگ کا آغاز،افغانستان کا میدانِ جنگ،دانشوروں کے فکری رویے،عالمی سیاست کے مخفی حقائق،یک قطبی دنیا کی تشکیل،پیداواری ذرائع پر تصرف،اردو ادب کے موضوعات ہیں اور اردو ادب کے مشاہیر نے اپنی تخلیقات میں ان پر بھر پور صدا احتجاج بلند کی ہے۔اُردو ادب میں سانحہ 9/11 اور مابعد اثرات کا احاطہ اردو شاعری،افسانے اور ناولوں میں موجود ہے۔

اُردو شاعری میں مزاحمتی رویے کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔سانحہ 9/11 کے بعد اس میں اور تیزی آ گئی۔ورلڈ ٹریڈ سنٹر پر حملہ اور اس میں بے گناہ لوگوں کی ہلاکت،اس کے ردِعمل میں امریکہ کا افغانستان پر حملہ اور افغانی شہریوں کی ہلاکت،عراق پر حملہ اور اس کے باغوں،میناروں،صحنوں،شہریوں،اور اس کی چڑیوں کی شہادت،پاکستان کے شہروں میں بم دھماکے اور پاکستانی شہریوں کی شہادت،سکول،کالج،اور یونیورسٹیوں پر حملے،ان سب موضوعات کا احاطہ اُردو شاعری میں کیا گیا ہے۔سانحہ 9/11 کے بعد امریکہ نے افغانستان پر کئی طرح کے اسلحہ جات اور نئی سے نئی جنگی تکنیک اور حکمت عملی کا استعمال کیا ہے،جن میں کنٹرولڈ ڈیمالیشن،ٹی اے ٹی پی،یا ٹرائی ایسی ٹون ٹرائی پرآکسائڈ،ری سین نامی زہر،جو عوامی مقامات پر پھیلایا جاتا ہے،ڈرٹی بم،کارپٹ بمباری اور ڈرون حملے قابلِ ذکر ہیں۔

ان میں ایک تکنیک افغانستان ، پر ڈیزی کٹر بموں کا استعمال ہے ۔ڈیزی کٹر کا حملہ ہوتے ہی گھر اور اس میں رہنے والے انسان دھویں اور مٹی میں مٹی ہو کر گہرے گڑھے میں دفن ہو جاتے ہیں ۔اس حوالے سے غلام حسین ساجد کی نظم ''ڈیزی کٹر'' بہت اہم ہے۔جس میں ڈرون حملے کی تباہی اور ہولنا کی کو بڑے ہی موثر انداز سے بیان کیا ہے۔

ڈیزی کٹر

ریت میں ڈھلتے پتھر

پانی ہوتی ریت

دھند میں چھپتا پانی

دھوپ میں جلتی دھند

دھویں میں گھلتی دھوپ

نیند میں بہتا زہر

سلگ اُٹھے ہیں

ایک طلسمی آنچ سے کتنے شہر

کون ہے جس نے

خواب نگر پر ڈھایا ہے یہ قہر(۷)

دوسری نظم آفتاب اقبال شمیم کی ''گیارہ ستمبر'' ہے جس میں امریکہ کی سرزمین پر ہونے والے حملے کا دکھ بیان کیا گیا ہے ،اور جہاز کو آگ کی ایک کنکری قرار دیا ہے جس کی وجہ سے یہ آگ ساری دنیا میں پھیل گئی۔اس نظم میں ان بے گناہ لوگوں کی موت پر بھی افسوس کیا گیا ہے ،جن کا کوئی قصور نہ تھا۔آفتاب اقبال شمیم اپنے دکھ کو یوں بیان کرتے ہیں۔

سنا ہے

شہرِ اول کی جبیں پر آگ کی

اک کنکری آ کر گری ہے

وہ زور آور

اچانک چوٹ لگنے پر بہت برہم ہوا ہے

شکوہِ کج کلاہی کم ہوا ہے

زرِ مشہور نا قدری سے گہنایا گیا ہے

ہمیشہ کے جریدے میں ہی لکھا ہوا ہے

پایا گیا ہے

کہیں داود نے جالوت پر حملہ کیا ہے

فقیر تکیہ دل ہوں

بہت رویا ہوں اِن کے واسطے

جو مفت میں مارے گئے

سکندری کی تمنائے جہاں گیری پہ جو وارے گئے ہیں (۸)

ایک اہم نظم پولینڈ کی نوبیل انعام یافتہ شاعرہ وسوا واشمبو رسکا کی ہے جس کا ترجمہ آصف فرخی نے ''گیارہ ستمبر کی تصویر'' کے عنوان سے کیا ہے۔ اس نظم میں ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی عمارتوں کا جلنا اور لوگوں کا عمارتوں سے گرنے کی منظر نگاری کی ہے، کہ کس طرح لوگ جلتی ہوئی عمارتوں سے گرنے لگے، کس طرح وہ لوگ ہوا میں معلق رہے جن کو کچھ دیر بعد زمین پر آ کر بکھر جانا تھا۔ یہی لوگ کچھ دیر پہلے بالکل سلامت تھے، لیکن پھر نہ جانے کیوں منزلوں سے چھلانگ لگانے لگ گئے۔ اس نظم میں شاعرہ نے صرف ان لوگوں کی پرواز کو بیان کیا ہے اس سے آگے شاعرہ کوئی سطر کا اضافہ نہیں کرنا چاہتی ہے۔ ان کا بیانیہ درد بھرا ہے۔

عمارتوں کی جلتی ہوئی منزلوں سے وہ کودنے لگے۔

ایک، دو، چند اور

اونچی، نیچی۔

اس تصویر نے اِن کو زندگی میں روک دیا

اور اب اِن کو روکے ہوئے ہے

زمین سے اوپر زمین کی جانب

اِن میں سے ہر ایک ابھی تک پورا ہے

اپنے خاص چہرے کے ساتھ

اور خون اچھی طرح چھپا ہوا ہے۔

ابھی اتنا وقت باقی ہے

کہ بال کھل کر بکھر جائیں،

چابیاں اور سکّے

جیبوں سے گر پڑیں

وہ ابھی تک ہوا کی دسترس میں ہیں،

ان جگہوں کے قطب نما

جو ابھی ابھی کھلی ہیں۔

میں ان کے لیے بس یہی دو باتیں کرسکتی ہوں۔

ان کی یہ پرواز بیان کر دوں

اور اس میں آخری اضافہ نہ کروں۔(۹)

ثروت زہرا کی نظم ''ایک اور فتح کے بعد'' بھی اس لحاظ سے ایک عمدہ نظم ہے کہ اس میں شاعرہ نے کلسٹر بموں کی ہولنا کیوں کو بیان کیا ہے اور اس تباہ کن بمباری کے اثرات کو موضوع بنایا ہے کہ آنے والی نسل اب زبان ،کلسٹر بموں کی پیدا کردہ ہولنا کیوں سے سیکھی گی ،درد اور چیخوں سے ای میل بھیجیں گی۔لیکن شاعرہ کلسٹر بموں کی ہولنا کیوں کے بعد بھی مایوس نہیں ہوئی ہے، بلکہ اس وحشیانہ پن کے بعد بھی ایک نئی دنیا ،ایک نیا جہان بسانے کا خواب دیکھ رہی ہے جو تیسری دنیا کی ایک روایات رہی ہے۔ثروت زہرا بیان کرتی ہے:

کلسٹر بم کے ٹکڑوں سے

مری دھرتی

نئی دنیا اگائے گی

ہوا مردہ گلے جسموں کی بو میں

لڑکھڑائے گی

ڈری سہمی ہوئی مائیں

اب اپنے وقت سے پہلے

زمانے کے ادھورے طفل جمیں گی

کھلی آنکھوں میں حیران سمیٹے میرے بچے

اب زبانیں، درد سے آہوں سے

اور چیخوں سے سیکھیں گے

بلیک آوٹ میں بیٹھے

ایڈسن کو میل کریں بھیجیں گے

عقوبت خانوں میں

بے داغ جسموں پر

زمانے کے ستم توڑے گئے تو کیا

ہم ایوریوتھ(Everyouth) کریموں سے

ہر ایک سلوٹ چھپالیں گے

کلوننگ کے لیے خلیے ملیں گے

فرد ہم پھر سے بنالیں گے

زمین یہ بجھ گئی تو کیا؟

کسی اور بھی سیارے پر جا کر ہم

نئی دنیا بسالیں گے(۱۰)

9/11 کوسب سے زیادہ موضوع بنانے والا شاعر ذی شان ساحل ہے۔اس حوالے سے اُن کی کتاب جنگ کے دنوں میں بہت اہمیت کی حامل ہے۔اس موضوع پر ان کی اول کوشش ''ہمارے پاس'' ہے جس میں بتایا گیا ہے کے اے لوگوں تمہارے خوابوں کا ذخیرہ اب ختم ہونے کو ہے،تم سے جتنے بھی وعدے کیے گئے تھے اُن کی کوئی اہمیت نہ تھی ۔ بلکہ تم لوگ غربت اور افلاس کو ہی اپنی تقدیر سمجھو۔آئندہ سے موت ہی تمہاری ساتھی ہے ۔امن کے سارے معائدوں پر تمہارے ہی خون سے دستخط ہوں گے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ تم لوگوں کو یاد بھی نہ ہوگا کہ تمہاری کوئی تہذیب بھی تھی یا کوئی تاریخ یا جغرافیہ بھی تھا۔اس کے علاوہ اپنی ایک نظم ''ورلڈ آرڈر'' میں مغربی پالیسی سازوں کی واحد عالمی حکومت کے خواب کو یوں بیان کیا ہے:

دنیا میں اب سے پہلے جو کچھ ہوا ہے

دوبارہ نہیں ہونا چاہیے

اور جو کچھ ہورہا ہے

آئندہ نہیں ہو سکے گا

ہم ایک پالیسی کے تحت

زندگی اور براعظموں کے موسم تبدیل کر رہے ہیں

وسطی امریکہ میں ہونے والی موسلا دھار بارشیں

اپنے وقت پہ ہوں یا نہ ہوں

اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا

ایمیزون کے جنگل کی جگہ

بیس بال کے میدان اور ٹینس کورٹ بنائیں گے

بل گیٹس نے وعدہ کیا ہے کہ

فٹ بال سے محبت کرنے والے نوجوانوں کو

کمپیوٹر سکھانے کے لیے

نیٹ کیفے قائم کیے جائیں گے

برونائی کے سلطان نے تیسری دنیا کے عوام کے

موسیقی کے شوق میں اضافہ کرنے لے لیے

ٹیلی کنسرٹ کی تجویز دی ہے

چھوٹے ملکوں کے دفاع کو بہتر بنانے کے لیے

''ہتھیار سب کے لیے'' نامی اسکیم شروع کی جارہی ہے

ہمارا ایجنڈا واضح ہے اور قیامت تک چلنے والا ہے

ہمارے ماہرین ہر جگہ سمجھی جانے والی

اشاروں کی زبان تیار کر رہے ہیں

ہم ساری دنیا کے لیے نیا قومی ترانہ لکھ رہے ہیں

ایک ایسا پرچم تیار کیا جا رہا ہے

جو بہت جلد آپ کے دلوں پر لہرا رہا ہوگا

آنکھوں پر باندھنے والی پٹیاں

ہم پہلے ہی آپ تک پہنچا چکے ہیں (۱۱)

اس کے علاوہ ذی شان ساحل کی ایک اور نظم ''ہتھیار'' جس میں بتایا گیا ہے کہ ہمارے ہتھیار کہاں تک جا سکتے ہیں، ان ہتھیاروں کی پہنچ کا علم آپ کو نہیں ہے، اور نہ ہی آپ یہ جانتے ہیں کہ یہ ہتھیار کیا کچھ کر سکتے ہیں، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہمارے ہتھیار آپ کی تلاش میں ہیں یہ کبھی بھی آپ کو تلاش کر سکتے ہیں۔ ہماری طرف سے آپ کو یہ ایک عارضی تنبیہ ہے، فیصلہ آپ کے ہاتھ میں ہے کہ آپ ان سے بچتے ہیں یا ان کو استعمال ہونے کا مواقع دیتے ہیں کیونکہ جنگ تو شروع ہو چکی ہے۔ اس کے علاوہ ذی شان ساحل کی دوسری نظموں میں ''ہمیں عراق کو''، ''جو آواز کسی تک نہیں پہنچ رہی ہے''، ''یہ نظم''، ''آپ کی محبت''، ''نازک الملائکہ کے لیے''، ''عراقی عوام''، ''نظم''، ''صدام حسین کے لیے''، ''صدام حسین نظم لکھتا ہے''، ''الجزیرہ خاموش ہو جائے گا''، ''ایک اطلاع''، ''نظم''، ''بغداد کوئی خط نہیں لکھتا''، ''ایک فتح کا اعلان نامہ''، ''ہمیں کسی سے کوئی شکایت نہیں''، ''امریکی وہیل چیئر جمع کریں گے''، ''عراق سے ایک آواز''، ''فاختہ''، ''اور وہ یہ جنگ جیت جائیں گے'' قابلِ ذکر نظمیں ہیں جن میں افغانستان اور عراق کی تباہی و بربادی کو بیان کیا گیا ہے اور دنیا میں ہونے والی تبدیلیوں اور پالیسیوں پر کھل کر بات کی گئی ہے۔

احمد ندیم قاسمی کی نظم ''عراقی عوام کا نوحہ'' بھی ایک اہم نظم ہے لیکن اس کا بیانیہ مشکل ہے۔ اس نظم میں عام روش سے ہٹ کر لفظوں کا استعمال کیا گیا ہے جس کی وجہ سے نظم کا مفہوم واضح نہیں رہا۔ اس نظم میں تضاد کی کیفیت کو پیدا کیا گیا ہے کہ جو چیز ہمارے لیے دوزخ ہے وہ مغربی لوگوں کے لیے ایک نیا حرفِ شنیدہ ہے،

ہمارا خون کس طرح کشید کیا جا رہا ہے۔ہم پر ہر ساعت گردن زدنی کی جا رہی ہے۔احمد ندیم قاسمی نے ان سب باتوں کو اشعار میں یوں سمویا ہے:

جو ہمارے لیئے اک دوزخ دیدہ ٹھہرا
وہ تمھارے لئے اک حرفِ شنیدہ ٹھہرا
ان دنوں جو گزرِوقت رمیدہ ٹھہرا
وہ ہمارا سفر خونِ کشیدہ ٹھہرا
ہم پہ گردن زدنی کی گئی ہر ساعت زیست
ہر نفس قطرہ، یک اشک چکیدہ ٹھہرا
نبض ہستی کی ہر اک ضرب بنی ضرب الیم
تارِ جان جیسے سرِخار خلیدہ ٹھہرا
ذائقہ اپنے لہو کا ہے دہن میں اپنے
خشک ہونٹوں پہ فقط خونِ چشیدہ ٹھہرا
جس خرابے کو کبھی صحنِ چمن گئے تھے
وہ اب اک خرمن سرہائے بُریدہ ٹھہرا
ما سوا ئے رنگ اجل کے،جو کھلا ہے ہر سو
اب ہر اک رنگ فقط رنگِ بریدہ ٹھہرا
اپنی تقدیر نہیں رات کی اندھی آنکھیں
آسماں پر نہ کوئی ماہ، رمیدہ ٹھہرا
قصر شایان میں رہا،خوف کے پیاسوں کا قیام
فانی کا غرورِ جاودانی (۱۲)

اس کے بعد حسین مجروح کی نظم ''مرجینا کی واپسی'' بہت اہم ہے جس میں تباہ شدہ بغداد کی تصویر کشی کی گئی ہے کہ بمباری کے بعد عراق کی گلیاں بے آباد ہو چکی ہیں، شہر کی تمام فصیلیں گرا دی گئی ہیں، جو ملک علی بابا کا مسکن تھا وہاں اب چوروں کی آمد ہے۔ اس نظم کا بیانیہ بہت ہی دلچسپ ہے۔ لیکن شاعر کہتا ہے کہ یہ سلسلہ یہیں پر ہی ختم نہیں ہوا ہے بلکہ نہ جانے اس کے بعد کس کی باری ہے۔ شاعر کہتا ہے

نئے بغداد کی بے آرزو گلیوں میں

پہریدار چوکس ہیں

ہوا خاموش ہے اور دودھیا، بے سُو دیا شمعیں

فراقِ صبح میں ایسے پگھلتی ہیں

کہ شب زادوں کو اندازہ نہیں ہوتا

فصیلیں ڈھے گئیں کب سے

کہ اپنے آپ سے بیزار شہروں میں

سوائے چور دروازے کے

دروازہ نہیں ہوتا

نئے بغداد کے بے فیض موسم میں

علی بابا کا مسکن ہے

جہاں حُلیے بدل کر مہربان، مہمان آتے ہیں

فضا میں خوف طاری ہے

پذیرائی کی شادابی سے مالا مال مرجینا

فنا فی الحال مرجینا

کا رقصِ مرگ جاری ہے

نجانے کس کی باری ہے (۱۳)

شاعری کے بعد افسانہ نگاروں نے بڑی عمدہ مہارت سے گیارہ ستمبر کے بعد کی صورتِ حال کو موثر انداز سے بیان کیا ہے ۔بعض افسانہ نگاروں نے بیانیہ انداز کو اپنایا ہے ،تو کسی نے علامتی انداز میں گیارہ ستمبر کی خود ساختہ صورتِ حال کو بیان کیا ہے ۔

اس حوالے سے افتخار نسیم کا افسانہ ''پردیسی'' بہت اہمیت کا حامل ہے ۔اس افسانے کا مرکزی کردار اسلم ہے ،جس کو غلام محمد ۱۹۴۷ء کے فسادات کے دوران اپنے گھر لے آتا ہے ۔گھر میں اس کی ہر طرح سے دیکھ بال کی جاتی ہے ۔کسی کو بھی اس بچے کا ماضی نہیں پتا کہ یہ کون ہے ،اس کے ماں باپ کون ہیں ،زندہ ہیں یا فسادات میں مر چکے ہیں کچھ معلوم نہیں ہوتا ۔دائی رسولاں کا جملہ کہ ''کیا پتا ہندو ہے یا مسلمان'' اس کے ماضی کی طرف اشارہ کرتا ہے ۔سید بی بی نے اس بچے کو اپنا دودھ پلایا کیونکہ بچے کا کوئی مذہب اور ذات نہیں ہوتی ہے ۔فساد کی پیدائش سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا ۔مسلمان کا دودھ پیا ہے اس لیے یہ بھی مسلمان ہے ۔مذہب کی مالا اس کے گلے میں ڈال دی گئی تھی ۔سید بی بی امانت میں خیانت نہیں کرنا چاہتی تھی ۔وہ چوری چوری اپنے نوکر کو ہندو اور مسلمان کیمپوں میں بھیجتی کہ شاید کوئی عورت اپنا بچہ ڈھونڈ رہی ہو ۔نوکر بار بار میونسپل کمیٹی جاتا ،مگر وہاں تو کوئی اور ہی دنیا کے آثار تھے ،آنے والوں کو جانے والوں کے گھروں میں بسایا جا رہا تھا ۔

اس کا نام اسلم رکھا گیا ۔سکول میں داخل کرادیا گیا اور باپ کے خانے میں غلام محمد کا نام لکھ دیا گیا اور تاریخ پیدائش پاکستان بننے سے ایک سال پہلے کی درج کی گئی ۔لیکن اس سب کے باوجود وہ شناخت حاصل نہ کر سکا ۔قسمت کے لحاظ سے وہ ابھی تک بدیسی تھا ۔میٹرک کرنے کے بعد اس کو لاہور کالج میں داخلہ مل گیا ۔غلام محمد کی وفات کے بعد اس کے بیٹوں نے اسلم سے چھٹکارہ حاصل کرنے کا سوچا اور اُن کو گھر سے چلے جانے کو کہا گیا ۔ہجرت کا دوسرا سفر شروع ہوا ۔اسلم امریکہ کے شہر شکاگو جا پہنچا ۔ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی تباہی میں اس کا کوئی ہاتھ نہ تھا ،مگر اس جیسے تمام رنگ و نسل کے امن پسند لوگوں کو مجرم گردانا جا رہا تھا ،کیونکہ ان امن پسند لوگوں کا رنگ اور نسل ان کا اصل پاسپورٹ تھا جو ان کی شناخت کا پتا دیتا تھا اسلم پر ۱۹۴۷ء کے اثرات ابھی تک ختم نہیں ہوئے تھے ۔ایک دن کسی امریکن کی آواز آئی'' Go back to your country mother f'' نفرت کی

اس گولی سے اس کو احساس ہوا کہ وہ ابھی تک پیدائشی پردیسی ہے۔

گیارہ ستمبر کے حوالے سے دوسرا عمدہ افسانہ علی حیدر ملک کا ہے۔جس کا عنوان ہے''دہشت گرد چھٹی پر ہیں'' یہ جملہ ایک مذاکرے کے دوران جمیل شیرازی نے ادا کیے تھے،جس کا انعقاد ایک این جی او نے کیا تھا، جس میں ادیبوں،صحافیوں،دانش وروں،اور سیاست دانوں نے دہشت گردی،اسباب اور تدارک کی تدبیر کے حوالے سے معنی خیز تقاریر کیں۔مذاکرہ ختم ہوا تو جمیل شیرازی گھر کے لیے روانہ ہوا مگر گھر نہ پہنچ سکا۔بیوی نے تھانے میں جا کر بتایا،مگر ایس ایچ او نے بڑی بے نیازی سے معاملہ ٹھنڈا کر دیا۔لیکن اس کے بعد اُس کی بیوی نے میڈیا کو تمام صورتِ حال سے آگاہ کیا،تو خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔لیکن اس کے دوسرے دن جمیل کی لاش سپر ہائی وے کے کنارے ایک جھاڑی میں سے ملی۔لاش بری طرح سے گولیوں سے چھلنی کر دی گئی تھی۔جب یہ خبر عام ہوئی تھی تو مختلف سیاسی،سماجی اور تنظیموں کی طرف سے حکومت اور سرکاری اداروں کے خلاف غم و غصہ کا اظہار کیا۔سماجی کارکن عباس غوری نے کہا جب تک اصل مجرموں کی بجائے بے گناہ لوگوں کو پکڑ کر سزا دی جاتی رہے گی،تو دہشت گردی کا سلسلہ جاری رہے گا۔تقریر کے بعد عباس غوری گھر کے لیے روانہ ہوئے مگر گھر نہ پہنچ سکے۔علی حیدر ملک نے اس افسانے میں گیارہ ستمبر کے سانحہ کے بعد غیر یقینی صورتِ حال کی طرف اشارہ کیا ہے،اس کے علاوہ قانون نافذ کرنے والے افراد اور ایجنسیوں کو سخت تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔

عراق کی تباہ کاریوں کی داستان الطاف فاطمہ کے افسانے''دیدا و دید''میں پُر اثر انداز میں بیان کی گئی ہے۔یہ گیارہ ستمبر کے بعد امریکہ کا عراق کے شہر بغداد پر حملے کی تباہ کاریوں کی داستان ہے۔یہ بغداد ہارون الرشید کا بغداد تھا،جہاں کبھی وہ رات کے وقت بھیس بدل کر گلی محلوں میں گشت لگا کر لوگوں کے حالات دریافت کرتے تھے۔اس وقت اس ملک کے شہر آباد تھے،اس کے بازاروں میں مال فراوانی سے موجود تھا،ضروریات زندگی کے لیے اناج بکثرت ملتے تھے،بھٹیارنیں خوشحال تھیں،سقّے شربت بیچتے، بازاروں میں کابل و قندھار،ایران و توران کے قالین اپنی دلکش نمونے کے ساتھ ملتے،داستان گو چبوترے پر بیٹھ کر داستان سناتا،رات بھر کتب خانوں میں موٹی شمعیں روشن رہتی اور عالم فاضل اہل قلم تصنیف و تالیف اور مطالعے میں مصروف رہتے، یہ بغداد کا شاندار ماضی تھا۔مگر اب اس کی عمارتیں کھنڈر کر دی۔ان کھنڈروں میں اب انسانی خون اور اعضاء

مدفون ہیں ۔راشن کے حصول کے لیے لمبی قطاریں لگی ہوئی ہیں۔ یہاں کے لوگوں کے دلوں میں ہزاروں جنازے موجود ہیں۔اب یہاں سچ بولنے کی اجازت نہیں ہے۔لوگ دوا کے بغیر سسک سسک کر مر رہے ہیں ، میزائلوں اور راکٹوں کی بارش ہے ۔سچ بولنے والا بی بی سی کا صحافی بھی اب اس دنیا میں نہیں ہے جس نے اپنی جان کی قیمت ادا کر کے صرف ایک سچ بولا تھا۔

بغداد کے ہی پس منظر میں لکھا ہوا ایک اور افسانہ انور زاہدی کا ''یہ جنگل کٹنے والا ہے''جس میں خواب کی تکنیک کو استعمال کرتے ہوئے مصنف نے بغداد کی صورتِ حال کی دلکش عکاسی کی ہے ۔خواب میں ہلاکو کے دور کی تباہی اور آج کے دور کی تباہی کا موازنہ بھی کرایا گیا ہے ۔ ہلاکو کا فتح شدہ بغداد کا اسی فیصد آبادی سے محروم ہو چکا ہے ،تہذیب یافتہ شہر کے کتب خانے جل جانے کے بعد سلگ رہے ہیں علماء مشائخ و سادات سب تہہ تیغ کر دیے گئے تھے ۔اس کے بعد ہلاکو کا لشکر شہر کو جی بھر کر لوٹتے ہیں ،خلیفہ کے محل سرا میں گھس کر وہاں سے سات عورتوں اور تیرہ سو خدام کو گرفتار کر کے عسکر میں لے آتے ہیں اور ان کو آپس میں بانٹ لیتے ہیں ۔ بغداد سے چلتے ہوئے ہلاکو کہتا ہے بغداد کو دوبارہ آباد کرو۔

گیارہ ستمبر کے بعد بابل و نینوا کی سرزمین کو دوبارہ آگ و خون میں نہلا دیا تھا۔سات سو برس پہلے جو ہلاکو نہ کر سکا اب ''New World Order'' کے تحت سب کچھ بھسم کر دینے کے در پے تھا۔لیکن اس دفعہ انداز بھی الگ تھا۔فضاء سے بم پھینکے جا رہے تھے ،اس دفعہ نئے ہلاکو یہاں کے تیل اور عوام کو اپنے تابع کرنے آئے تھے ،تا کہ ان کے تیل سے اُن کے شہروں کی رنگینی قائم رہے ۔ نئے حملہ آوروں نے ہلاکو کی نقل میں کہا ہم اب بغداد کو پھر سے آباد کریں گے ۔

مسعود مفتی کا افسانہ ''شناخت'' پر بھی گیارہ ستمبر کے اثرات نمایاں طور پر دیکھے جا سکتے ہیں ۔اس میں امریکہ میں مقیم پاکستانیوں پر 9/11 کے اثرات کو موضوع بنایا گیا ہے ۔اس افسانے میں دو کردار خالد اور سلیم ہیں ،جو مذہب اور شادی پر مقالماتی انداز میں بحث کر رہے ہیں ،خالد مذہب کو خاطر میں نہ لانے والا ہے۔اُن کو اپنے کلچر کا بھی احساس نہیں ہے ۔وہ تو اپنے سگّے ماں باپ اور بہن بھائیوں سے تعلق توڑ کر امریکن لڑکی جو زفین سے شادی کرتا ہے ۔لیکن حقیقت اُس وقت سامنے آتی ہے ،جب ایک واقع کی گونج نے صورِ اسرافیل کی طرح سارے عالم کو دم بخود کر دیا ۔انتقام کی آگ میں مغربی استعماراتی ہاتھیوں کی چنگھاڑ اور پاگل پن میں

جنگ کی یلغار نے ساری انسانیت کو اپنی آگ کی لپیٹ میں لے لیا۔ بم و بارود کا طوفان تھمنے میں نہ آتا۔اس صورتِ حال نے خالد کے اندر عدمِ تحفظ کا احساس جگا دیا تھا۔

اس کا احساس اُس وقت یقین میں بدل گیا جب ایک دفعہ اُن کی اپنی بیوی جوزفین کا بھانجا Bill،اور اس کے اپنے بیٹے کے دو دوست ایک بنگالی شخص مفیض کو جارحانہ انداز میں دھمکا رہے تھے۔ خالد کے منع کرنے پر Bill نے کہا انکل یہ القائدہ کا دہشت گرد ہے۔دوسرا بولا''طالبان''''ہم اس کو سبق سکھائیں گے'' اس واقعہ کے بعد خالد کو اصل خطرے کا احساس ہوا اور نماز پڑھنے مفیض کے پیچھے پیچھے مسجد چلا جاتا ہے۔

منشایاد کا افسانہ ''سائیکلو سٹائل وصیت نامہ'' کا موضوع 9/11 کے بعد پاکستان کے شہروں میں دہشت گردی کی لہر اور بم دھماکوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہے۔اس افسانے میں اس بات کا بھی احاطہ کیا گیا ہے کہ دہشت گردی کے محرکات کیا ہیں۔اپنے مقاصد کے لیے کس طرح مذہب کی اپنی طرف سے تفسیر بیان کر کے عام لوگوں کو استعمال کیا جاتا ہے۔اس ساری صورتِ حال کا تذکرہ منشایاد نے بھرپور انداز سے پیش کیا ہے۔

مصطفیٰ کریم کا افسانہ ''عجائب گھر'' اپنے علامتی انداز میں گیارہ ستمبر اور ماقبل کا شاہکار ہے۔اس کے کردار اصلی کرداروں کی زندگی کو بے نقاب کرتے ہیں اور عصری صورتِ حال کا ذمہ دار ان ہی کرداروں کو ٹھہراتے ہیں۔اس کے کردروں میں جنرل ٹائیگر، ملا البغاؤں، ندرت ہاشمی، ہوشیار خان قابلِ ذکر ہیں۔ اس افسانے کا ہر کردار ایک مکمل عہد کی داستان کی علامت ہے۔

نیلوفر اقبال کا افسانہ ''اوپریشن مائس'' سانحہ 9/11 کے انتقام کے کہانی ہے۔اس میں دو مرکزی کردار جنرل موسی اور ان کی بیوی مارتھا ہے۔دونوں مکالماتی انداز میں عراق پر حملے کے حوالے سے باتیں کرتے ہیں۔ جنرل موسی کہتا ہے کہ وہ ان چوہوں کو ختم کر دینا چاہتا ہے جو دنیا میں تیل کے بڑے ذخائر پر قابض ہیں۔جنرل موسی متضاد رویہ کا حامل شخص ہے اُس کو اپنی کتیا جس کا نام برطانوی وزیراعظم کے نام پر بلیر رکھا ہوا ہے مرنے کا بڑا افسوس ہے مگر انسانوں کو مارنا اپنا فرض سمجھتا ہے۔امریکہ ماحول میں پلنے والی یہ خصوصیت مشہور ہے۔ان کی بیوی جو ایک رائٹر ہے ان سے مختلف شخصیت کی مالک ہے۔

اُس کا ضمیر اُس کو جھنجھوڑتا ہے کہ ضرور کوئی اور مسئلہ ہے جس کے لیے یہ جنگ کی جا رہی ہے۔ جنرل موسی کی باتیں بڑی ہی معنی خیز ہیں جو تیسری دنیا کے عوام کی بیوقوفی، سادگی، اور اُن کے حکمرانوں کی جابر و شاطر

پالیسیوں سے آگاہی فراہم کرتیں ہیں ۔جنرل موسی اپنی بیوی مارتھا سے کہتا ہے یہ جنگ اس طرح لڑی جائے گی کہ جگہ بھی ان کی اور روپیہ بھی ان کا ہوگا ۔ان کے لیڈر اتنے بزدل ہیں کہ اپنا روپیہ بھی اپنے ملک میں نہیں رکھتے ۔ڈرتے ہیں کہ اُن کے لوگوں کو ان کی دولت کی خبر نہ ہو جائے ۔پھر ان میں سے کوئی چوہا مر جاتا ہے اور ان کی دولت ہمارے بینکوں میں پڑی رہ جاتی ہے ۔ان کے لیڈروں کا یہ حال ہے کہ ہمیں ان کے لیڈروں کو بناتے ہیں اور ہمیں ان کو ہٹاتے ہیں ۔یہ عجیب لوگ ہیں ۔اس لحاظ سے یہ افسانہ مکمل طور پر اپنے عصری حسیت کے ساتھ جڑا ہوا ہے ۔

نیلوفر اقبال کا دوسرا افسانہ ''سرخ دھبے'' جو کہ اوپریشن مائس کا ہی دوسرا حصہ ہے ۔اس کا موضوع بھی گیارہ ستمبر کے بعد امریکیوں کی عراق میں موجودگی ہے ۔جس میں دو کرداروں ٹونی اور جیمز کو عراق سرزمین پر دکھایا گیا ہے ۔ٹونی کہتا ہے کہ ہم نے ایک پورا ملک تھوڑی سی دیر میں فتح کر لیا ہے ،اور وہ ملک جو An oil rich country ہے ۔اس سے امریکہ کا سب سے بڑا مسئلہ حل ہو جائے گا ،بیروزگاری ختم ہو گی ،تیل کی ساری دولت ہماری ہو گی ۔لیکن یہ ٹونی عراقیوں کے ہاتھوں مارا جاتا ہے ،جو عراقیوں کے غم وغصہ کا اظہار ہے ۔

مبین مرزا کا افسانہ ''دامِ وحشت'' کا موضوع سانحہ 9/11 کے بعد عوام کے ذہنوں پر خودکش حملوں کا ڈر وخوف کا نفسیاتی اثر ہے ۔اس کا مرکزی کردار شیخ سخاوت علی ہے ،جو جمعہ کی نماز پڑھنے مسجد جاتا ہے ،مسجد میں وہ ایک مشکوک شخص کو دیکھتا ہے اور خیال کرتا ہے کہ شاید اُس نے اپنے ساتھ بم باندھ رکھا ہے جو تھوڑی دیر میں سب کو ابدی نیند سلا دے گا ۔نماز کے آغاز سے لے کر سلام کرنے تک سنگین خوف اُس کے دل میں رہتا ہے ۔اُس کی نگاہوں میں وہ سارے مناظر پھرنے لگتے ہیں ،جو مسجدوں ،امام بارگاہوں میں بم دھماکوں ،خودکش حملوں کے حوالے سے ٹی وی پر دکھائے جاتے تھے ۔کٹے پھٹے جسم ،ٹکڑے ٹکڑے بکھرے انسانی اعضاء ،گاڑھا خون ،اس صورتِ حال نے عوام کے ذہنوں پر برا اثر قائم کیا ۔

زاہدہ حنا کا افسانہ ''نیند کا زرد لباس'' ایک معصوم افغان لڑکی پروین کی داستان حیات ہے کہ کس طرح وہ امریکی بموں اور میزائلوں کی بارش میں سفر کرتی ہوئی بغیر ہتھیلی کے باجوڑ پہنچی ۔کراچی میں اپنی نانی کے گھر آکر میٹرک تک تعلیم حاصل کی ۔وہ مزید تعلیم حاصل کر کے کسی یونیورسٹی یا کالج میں پروفیسر بننا چاہتی تھی ۔

مکتوبائی تکنیک کے ذریعے کہانی افغانستان پر امریکی مظالم کی داستان سے بوجھل ہے ۔پروین امریکی

صدر کے نام خط لکھ کر اُن کے مظالم کا شکوہ کرتی ہے کہ کیوں اُس نے ہمارے اوپر بموں اور میزائلوں کی بارش کا حکم دیا؟ ہمارے گھروں پر کس طرح بم برسائے گئے ،جس میں اُن کے گھر کے بہت سے افراد شہید ہو گئے ،اور اُن کے رشتہ کا ایک بھائی جو سستما سین ،ایشوریہ رائے اور کا جول کا فین تھا،جس کی خواہش تھی کہ بالی ووڈ جا کر ہیرو بنے گا ،وہاں بہت سے خان ہیں،وہ کابل کا خان کہلائے گا ،کس طرح ایک خود کش بمبار بن گیا۔آپ نے میرے بھائی بہن چھینے ،میرا شہر کھنڈر بنا دیا،میرا گھر دھویں میں غائب کر دیا،میری گلیاں تباہ کر دی ،میرا بچپن چھین لیا،میری زندگی کے سارے خواب چھین لیے آخر کیوں؟ آپ نے جب فضا سے ہمارے لیے کھانے کے ڈبوں کے ساتھ تتلیوں کے کھلونے بھیجے تو ہمیں معلوم نہ تھا کہ آپ نے ہمارے لیے ایسے کھلونے کیوں بھیجے جن سے میری بہت سی سہیلوں کے پر نچے اڑ گئے ،میری ہتھیلی بھی اڑ گئی ۔لیکن اُس کا یہ خط جس میں مغرب کی پالیسیوں اور منافقت کے عناصر کا بیان تھا ،امریکی صدر تک نہ پہنچ سکا ،کیونکہ جب اُن کو باجوڑ چھوڑنے کا سرکاری حکم نامہ ملا تو کابل جاتے ہوئے راستے میں امریکی بموں کی برسات نے اُس کو نیند کا زرد لباس پہنا دیا۔ اس وقت بھی خط اُس کی ہتھیلی میں تھا جس پر خون کے سرخ دھبے پڑ گئے تھے۔

پرویز انجم نے اپنے افسانے ''مہاجر پرندے'' میں پرندوں کے ذریعے کہانی بیان کرنے کی تکنیک کو برتا ہے ،جو مشرق ومغرب کے ادبیات کا خاصہ ہے ۔سنہری عقاب، چرخ،سفید بگلے،اور جنگلی کبوتروں نے افغانستان پر امریکی بربریت کی گوائی دی ،تو مرغابی نے عراق کی تباہی بیان کی ہے ہمک نے انسان کو فتنہ گر کا لقب دیا،سرخاب نے ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی تباہی کا نقشہ بیان کیا،سائبیریا سے آیا ہوا ست رنگا پرندے نے سرد جنگ کا قصہ سنایا۔ مینا نے سکھوں کے فسادات کو نظم کیا ،گِدھوں نے مینا کی بات کی گواہی دی ،مینا نے ہی کشمیری عورتوں کی بین کرنے کی داستان سنائی ،الّو نے اپنے حوالے سے مشرق ومغرب کا تضاد بیان کیا۔ ہر پرندہ انسانی تاریخ کی بربریت کا عینی گواہ تھا۔

محمد حمید شاہد کا افسانہ'' سورگ میں سؤر''تمثیلی انداز میں سوَرگ گاؤں کی صورتِ حال کو بیان کرتا ہے۔ جہاں پر بکریاں پالنے اور مونگ پھلی کی کاشت کر کے گاؤں کو آباد رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے ۔لیکن تھوتھنیوں والے سوروں نے ان کی زندگیوں میں دکھ بھر دیے تھے ۔اس حوالے سے محمد حمید شاہد لکھتے ہیں :

اُتار سے پرے اُدھر جہاں ہموار زمین پر سرکاری رَکھ تھی ،تھوتھنیوں والے وہاں

سے غول در غول آتے تھے اور ہماری زمینوں پر تباہی مچا کر واپس رَکھ میں جا چھپتے تھے۔ جب تک بکریاں ہمارے التفات کا محور رہیں، تباہی مچا کر چھپ جانے والوں کی تعداد بھی محدود رہی ... یا پھر...شاید اُن کا پھیرا ہی ادھر کم لگتا ہو گا۔ تاہم ہم احتیاط بھی تو کیا کرتے تھے، بیری، کیز، کیکر کے درختوں کی خار دار ٹہنیوں کے چھاپوں کی کھتیاں جوڑ کر ہم بکریوں کے باڑوں کو چاروں طرف سے محفوظ بنا لیا کرتے تھے۔ جب کبھی تھوتھنیوں والے ادھر آ نکلتے اور اپنی تھوتھنیوں کو ان چھاپوں پر مارتے تو کانٹوں کی چبھن اُنہیں اُلٹا بھاگنے پر مجبور کرتی...لیکن جب ہمیں مونگ پھلی کی فصل نے لگ بھگ بکریوں سے غافل ہی کر دیا تو وہ اندر تک گھس آئے۔ اُن کی تعداد اس قدر بڑھ چکی تھی کہ ناچار ہم سورگ والوں کو اُنھیں بھگانے کے لیے پالتو کتوں کی تعداد بڑھا دینا پڑی تھی۔ (۱۴)

محمد حمید شاہد نے بکریوں، کتوں اور سوروں کی علامتی انداز سے عصری صورتِ حال کو بیان کیا ہے۔ اس افسانے پر تبصرہ کرتے ہوئے نجیبہ عارف بیان کرتی ہیں:

محمد حمید شاہد کی کہانی ''سورگ میں سور''تمثیلی انداز میں عصری سیاسی و معاشرتی صورتِ حال کا تجزیہ کرتی ہے۔ بستی والے جنھیں بکریوں کے ریوڑ پالنے کا وصف ملا تھا اور جو اسے پاکیزہ فریضہ قرار دیتے تھے، جنگلی سوروں کے حملہ آرو ہونے سے پریشان تھے جو ان کی بکریاں ہلاک کر دیتے تھے۔ اس تدارک کے لیے اُنھوں نے کتے پالنے شروع کر دیے۔ مگر سوروں کی تعداد میں حیرت انگیز تیزی سے اضافہ ہونے لگا۔ اگرچہ اُنھوں نے بھی جواباً حفاظتی کتوں کی تعداد بڑھائی مگر یہ کتے خود بھی غنیم سے مل گئے یا ان کے ڈر سے بستی والوں کی بکریوں کی حفاظت سے قاصر رہے۔ علامتی سطح پر یہ عالمی گاؤں آباد کرنے کی خواہش میں بسی ہوئی بستیاں اجاڑ دینے والی مرگ آثار تھوتھنیوں کی کہانی ہے۔ معاصر صورتِ حال کے بیان کے لیے مصنف نے بکریوں، کتوں، اور سوروں کے استعارے خوبی سے بیان کیے ہیں۔ (۱۵)

9/11 سانحہ کے پس منظر میں لکھی گئی محمد حمید شاہد کی دوسری کہانی ''گانٹھ'' ہے۔افسانے کا کردار توصیف اپنے شعبے میں اسپیشلائزیشن کے لیے امریکہ جاتا ہے،اور امریکی ہی ماحول میں رس بس جاتا ہے۔ ایک امریکن لڑکی سے شادی کر کے اب وہ دو بیٹوں کا باپ بھی بن چکا تھا۔اُس کو مذہب سے کوئی دلچسپی نہیں تھا۔ اس کے بعد ایک روز یہ شہر دھماکوں سے گونج اٹھا۔محمد توصیف بلا معاوضہ انسانی خدمت میں جت گیا۔

حتی کہ اسی بات پر اس کو دھر لیا۔اور پھر ایک روز اُس کو اپنی بیوی بچوں بغیر ڈی پورٹ کر دیا گیا۔کہانی بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر توصیف کہتے ہیں:

> ان کا فیملی لائر کچھ پیپرز اگلے روز شام تک بنالایا۔وہ چاہتا تھا کہ ڈی پورٹ ہونے سے پہلے وہ ان پر دستخط کر دے۔اس نے ساری بات توجہ سے سنی۔شاید وہ دستخط کر ہی دیتا کہ اُس پر ذہنی دباو کا شدید دورا پڑا،اس قدر شدید کہ وہ لائر پر برس پڑا۔ جب وہ چلا گیا تو اسے خیال آیا کہ سارے پیپرز چاک کر کے اس کے منہ پر دے مارتا تو اس کے اندر کا ابلتا غصہ کچھ مدہم پڑ سکتا تھا۔اس نے اگلی ملاقات پر ایسا ہی کرنے کے لیے سارے پیپرز سنبھال کر رکھ لیے لیکن اس کے بعد اس کو ملنے کوئی نہیں آیا...یہاں تک کے اسے ائیر پورٹ لے جایا گیا۔جہاز میں سوار ہوتے ہوئے اس پر کھلا کہ ایک سو پچیس دوسرے پاکستانی بھی ڈی پورٹ کیے جا رہے تھے۔(۱۶)

اس کے علاوہ محمد حمید شاہد کا ایک اور افسانہ ''موت منڈی میں اکیلی موت کا رقص'' کا موضوع بھی مغرب اور اس کے اتحادیوں کی افغانستان اور عراق پر بے گناہ لوگوں کی اجتماعی موت ہے۔اس افسانے میں امریکا پر سخت تنقید کی گئی ہے۔

محسنہ جیلانی کا افسانہ ''عراق،عراق'' جیسا کہ نام سے بھی ظاہر ہے،کا موضوع بھی عراق پر امریکی بمباری سے لوگوں کی ہلاکت ہے۔بمباری سے سارا شہر تباہ ہوگیا ہے۔شہر کے تمام لوگ عمارتوں کے ملبے تلے ابدی نیند سو چکے ہیں۔صرف ایک عورت کو بڑی مشکل سے ملبے کے تلے سے کھینچ کا نکالا تھا،تو اپنے اردگرد کے ماحول کو پہچان نہ سکی،البتہ اس کا چھ ماہ کا بچہ اب اس کی گود میں نہ تھا۔عورت پور پور تک دکھ میں ڈوبی ہوئی ہے

جس کی عکاسی ان الفاظ میں کی گئی ہے

وہ نہیں جانتی تھی کہ ان پر یہ جنگ کیوں مسلط کر دی گئی ہے۔ وہ ایک عام سی گھریلو عورت تھی جسے دنیا کی سیاست سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اس کی ساری دنیا تو بس اس کا اپنا گھر تھا۔ اپنا خاندان تھا اور اپنا ننھا بچہ لیکن یہ چھوٹی سی کائنات آگ اور دھویں میں تباہ ہو کر رہ گئی تھی۔ (۱۷)

تمام افسانہ عراق پر امریکی بمباری، ہلاکتوں، اور طیاروں کی گھن گرج کی آوازوں سے لبریز ہے۔

اردو شاعری، اور افسانے کے بعد اگر اُردو ناول پر تنقیدی نظر ڈالی جائے تو اُردو ناول بھی سیاسی سماجی، اور عصری صورتِ حال کا مرقع ہے۔ اکیسویں صدی میں لکھے گئے ناول اپنے سیاسی، سماجی، عصری رجحانات، حادثات، واقعات، اور ان کے اثرات کو کما حقہ پیش کرتا ہے۔

اس حوالے سے خس و خاشاک زمانے کو اولیت حاصل ہے۔ مستنصر حسین تارڑ کا یہ ناول 1930 سے لے کر 9/11 کے فوراً بعد تک کی صورتِ حال کو بیان کرتا ہے۔ کہانی کرداروں کی مدد سے آگے بڑھتی ہے۔ اس ناول کے تمام کردار عجیب وغریب قسم کے ہیں، ان کرداروں سے یہ بخوبی معلوم ہو جاتا ہے کہ مستنصر حسین تارڑ کو کردار نگاری پر مکمل مہارت حاصل ہے۔ اس ناول کی تیسری نسل انعام اللہ سے شروع ہوتی ہے جو ناول کا اہم کردار بھی ہے کیونکہ یہاں سے ہی سانحہ 9/11 ناول کے پلاٹ کا حصہ بنتا ہے۔

انعام اللہ کے والدین کا کچھ پتا نہیں۔ وہ گرو مانگٹ کی مسجد کی سیڑھیوں میں پڑا ملا، اس سے پہلے کہ ایک نعت خواں دوسرے لوگوں کے ساتھ مل کر اس کو سنگسار کرتا، سرو سانسی یہ کہہ کر انعام اللہ کو بچا لیتا ہے یہ حرامی نہیں میرا بچہ ہے۔ انعام اللہ بڑا ہو کر ایک صحافی اور ناول نگار بن جاتا ہے۔ آسانی سے نہ دبنے اور ایک اختلافی کالم لکھنے پر ضیاء الحق کے دور میں ان کی کمر کو ننگا کر کے، اور منہ کے پاس جدید ٹیکنالوجی سے آراستہ مائک رکھ کر کوڑے برسائے جاتے ہیں تا کہ اُس کے منہ سے نکلنے والی چیخیں تمام شہر سن سکے۔ اس کے ساتھ ہی افغانستان اور سوویت یونین کا تذکرہ بھی خوبصورت انداز میں بیان کیا ہے، اس کو سانحہ 9/11 کا ماقبل بھی کہہ سکتے ہیں جس کے بہت سے ڈانڈے 9/11 سے ملتے ہیں۔

TH-19722

سانحہ ستمبر کی ہولناکی کو مستنصر حسین تارڑ اس طرح بیان کرتے ہیں :

ٹیلی ویژن پر اُس امریکی کربلا کا ایک ایک لمحہ ہزاروں بار دوہریا جا رہا تھا اور یہ باور کرایا جا رہا تھا کہ صرف دو نہیں ،ہزاروں ٹریڈ ٹاورز منہدم ہو رہے ہیں ....یہ مناظر اسی تواتر سے اتنی بار سکرین پر دکھائے گئے کہ ہر امریکی کے بدن پر تصویروں کی صورت ثبت ہو گئے...اُن کے ذہنوں پر ایک ٹیٹو کی مانند گندھے گئے ۔(۱۸)

پاکستان میں مذہبی تنگ نظری سے تنگ آ کر انعام اللہ امریکہ آتے ہیں ،مگر سانحہ ستمبر کے بعد انعام اللہ امریکی عوام کے تعصب اور تنگ نظری کا شکار ہوئے ۔حالانکہ وہ تمام مذہب اور عقیدے سے آزاد انسان تھا ۔انعام اللہ سانحہ ستمبر کے بعد کینیڈا ہجرت کرتا ہے جہاں پر اپنی عزت نفس کے مجروح ہونے کا احساس اُس کو خود کشی کرنے پر مجبور کرتا ہے ۔مگر سانسی کی پوتی شباہت اُس کو اس ارادے سے بعض رکھتی ہے ۔اور ایک نیا جہاں ایک نیا آدم تخلیق کرنے کو کہتی ہے ۔جہاں پر تعصب نہ ہو ،نفرت نہ ہو ،سانحہ ستمبر نہ ہو ،بم بارود کے دھماکے نہ ہوں ،صرف امن ہو ۔

اس کے بعد مستنصر حسین تارڑ کا دوسرا ناول قلعہ جنگی ہے ۔جو افغانستان پر امریکی حملے اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی تباہی کا بیان ہے ۔سانحہ ستمبر کے بعد امریکہ اور اس کے اتحادی بھوکے شیروں کی طرح غضب ناک ہو کر افغانستان پر چڑھ دوڑے ۔افغانستان پر بموں اور میزائلوں کی برسات ہو رہی تھی جس کے نتیجے میں سارا افغانستان کھنڈر بن چکا تھا ،چہرے مسخ ہو چکے تھے ،موت کی سیاہی نے سب کو ایک سیاہ رنگ عطا کر دیا تھا ۔رنگ و نسل کا امتیاز مٹ چکا تھا ۔بی باون طیاروں نے اُن کے جسمانی اعضاء ایک دوسرے سے الگ کر دیے تھے ۔اُن کے جسمانی اعضاء زمین اور تہہ خانوں میں ہر جگہ پر بکھرے ہوئے تھے ،بازو کہیں تو ہتھیلیاں کہیں اور تھیں ،سر کہیں اور دھڑ کہیں اور پڑے ہوئے تھے ۔جن کے بدن سلامت تھے وہ وقفے وقفے سے تھرتھراتے ۔بعض انسانی جسموں میں پٹرول بھر کر آگ دکھائی گئی تھی ۔کھیتوں میں لاشوں کی فصل کٹ چکی تھی ،لیکن ان کا کوئی وارث نہ تھا ۔ہر جگہ لاشوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے ،اسی لیے کسی افغان بچے کے لیے لاش کسی ڈر اور حیرت کا باعث نہ بنتی تھی ۔مستنصر حسین تارڑ بیان کرتے ہیں

لیکن ہزاروں برسوں سے کوئی ایک ساعت ایسی بھی گزری تھی جب وہ ایک دوسرے کے لیے یکسر اجنبی تھے ۔اُن کے چند ہتھیار ،سیاہ پگڑیاں ،اور جنون بظاہر

ایک جیسے تھے لیکن وہ ایک دوسرے سے رنگ و نسل ،ثقافت اور خصلت میں مختلف تھے ...وقت کی وہ ساعت جب وہ ایک دوسرے کے لیے اجنبی تھے قندوز کے محاصرے کے دوران اُن پر محیط ہوئی تھی ...وہ امریکیوں سے لڑنے آئے تھے لیکن وہاں اُن کے مدِ مقابل اُنھی کے عقیدے کے بارلیش لوگ تھے امریکی اوپر ہی اوپر کہیں آسمانوں میں تھے اور اپنا بوجھ گرا کر چلے جاتے تھے ...یہ بوجھ پندرہ ہزار پاونڈ وزنی ڈیزی کٹر ہوتے تھے جو عرف عام میں منی ایٹم بم کہلاتے تھے اور اس بوجھ کی بھڑک اور پھٹنے سے پورے پورے پہاڑی سلسلے میدانوں میں بدل جاتے تھے اور اُن کے دامن میں آباد گاوں اور بستیاں لمحوں میں دفن ہو جاتے تھے۔کلسٹر بم اور بنکر بسٹر بھی وہ بوجھ تھے جو اُن پر گرتے تھے۔(۱۹)

اس ناول کی کہانی کو قلعہ جنگی کے تہہ خانے کی تکنیک اور گھوڑے کی علامت کے ساتھ ،سات کرداروں کی مدد سے بیان کیا گیا ہے ،جو مختلف مما لک ،اور رنگ و نسل سے تعلق رکھتے تھے ۔یہ تمام مجاہد افغانستان میں امریکیوں سے لڑنے آئے تھے ۔یہ سات مجاہد انتہائی زخمی حالت میں پڑے اپنی اپنی کہانیاں بیان کرتے ہیں کہ وہ کس طرح اور کن کے کہنے پر جہاد میں شامل ہوئے تھے ۔اُن کو افغانستان بھیجنے والے کون سے عوامل تھے ۔یہ تہہ خانہ لاشوں سے بھرا پڑا ہے اور وہ ان لاشوں کے اوپر پڑے ،مرنے سے کچھ دیر پہلے اپنے اپنے ماضی کو یاد کرتے ہیں ۔

سانحہ 9/11 کے پس منظر میں ہی لکھا گیا تیسرا ناولٹ محسنہ جیلانی کا میں دہشت گرد ہوں؟ ہے ۔جس میں زرینہ کی زندگی کا سفر بیان کیا گیا ہے ۔ان کے والد علی اور سعیدہ ۱۹۴۷ء میں لٹ لٹا کر پاکستان آئے تھے ۔نقل مکانی کی بڑی وجہ قتل و غارت گری سے جاں بچانا تھا اور آزادی کا جذبہ تھا ۔اس کے بعد ان کے والدین کی دوسری ہجرت سن ساٹھ کی دہائی میں ہوئی اس دفعہ ان کے والدین اپنے ملک کو چھوڑ کر بہتر روزگار کی تلاش میں برطانیہ آئے تھے ۔زرینہ کی پیدائش برطانیہ میں ہوئی تھی ۔

زرینہ نے برطانیوی ماحول میں ہی اپنی تعلیم حاصل کی تھی ۔زرینہ ایک امن پسند لڑکی ہے ۔اُس کے لیے سب سے بڑا مذہب انسانیت ہے ۔اُس کے اپنی غیر مسلم سہیلیوں سے بھی بہت اچھے تعلق ہیں ،اُن کو اپنے

گھر کھانے پر مدعو کرتی ہے۔ اُس کے گلے میں مذہب یا کسی اور عقیدے کی مالا نہیں ہے۔ لیکن شادی کی ناکامی کے بعد اُن کا رجحان مذہب کی طرف ہو جاتا ہے۔ اب وہ پانچ وقت کی نماز پابندی سے پڑھنے لگتی ہے۔ صبح دیر تک قران پاک کی تلاوت کرتی ہے۔ باہر نکلتی ہے تو حجاب پہن کر۔ ان کا بیٹا بڑا ہو کر سوزن سے شادی کر کے امریکا جانے کا خواب دیکھتا ہے، کیونکہ وہاں ملازمت اور خوشحالی کے مواقع زیادہ تھے۔

سانحہ 9/11 کے بعد حالات یکسر تبدیل ہو جاتے ہیں، لوگوں کے رویے بدل گئے۔ برطانیہ میں بھی تمام مسلمانوں کو دہشت گرد سمجھا جانے لگا۔ حالانکہ جب زرینہ نے ٹی وی سکرین پر ٹریڈ سنٹر کے جڑواں ٹاوروں کو جلتے دیکھا تھا تو ان کی بھوک اڑ گئی تھی۔ زرینہ کو باہر آتے جاتے وقت دہشت گرد کہا جاتا، اُن کا حجاب کھینچا جاتا۔ اسی چیز نے زرینہ کو ذہنی مریضہ بنا دیا تھا، وہ ہر روز خواب دیکھ کر ڈرتے ہوئے چیخیں مارتیں۔ زرینہ کی اس حالت کے بارے میں محسنہ جیلانی بیان کرتی ہیں۔

> زرینہ کا کہنا تھا کہ اسے پولیس سے سخت خوف آتا ہے اور اسے ڈر لگتا ہے کہ پولیس والے اسے گولی سے اڑا دیں گے۔ کنسلٹنٹ جب بھی پوچھتا کہ وہ پولیس سے کیوں ڈرتی ہے تو وہ کہتی کہ اس لیے کہ میں مسلمان ہوں، میں حجاب پہنتی ہوں۔ وہ مجھے دہشت گرد سمجھتے ہیں۔ وہ مجھے دیکھتے ہی گولی سے اڑا دیں گے۔ (۲۰)

اس ناول میں بیانیہ انداز سے بتایا گیا ہے کہ کہ سانحہ 9/11 کے بعد کس طرح برطانیہ میں مقیم لوگ متاثر ہوئے۔ برطانوی لوگوں کا رویہ یکسر تبدیل ہو گیا اور یوں برطانیہ میں فرقہ واریت پھیل گئی۔ برٹش مسلم زرینہ کی کہانی ایک عالمی استفامیے کی صورت میں پیش کی گئی ہے۔ اس ناول میں تہذیبی شعور سے زیادہ عصری صورتِ حال کو بیان کیا گیا ہے، جس کے پسِ پردہ سانحہ 9/11 اور برٹش مسلم پر اس سانحہ کے اثرات کو بیان کیا گیا ہے۔

سانحہ 9/11 کے پس منظر میں چوتھا ناول یونس جاوید کا ستونت سنگھ کا کالا دن ہے۔ سانحہ 9/11 کے بعد پاکستان میں غیر یقینی صورتِ حال اس ناول کا موضوع ہے۔

جس میں بغیر کسی ثبوت یا جرم کے کسی بھی شخص کو اٹھا لیا جاتا تھا، نہ اُس کا جرم بتایا جاتا، نہ کسی عدالت میں پیش کیا جاتا، نہ کسی قسم کا کوئی انصاف، نہ رحم کیا جاتا تھا۔ یہ ساری صورتِ حال یونس جاوید نے ماضی کے

''رولٹ ایکٹ'' اور ''جلیانوالہ باغ'' کے تناظر میں پیش کی ہے۔ جس کے مطابق جب چاہو کسی کو اٹھا لو، مار دو قتل کر دو، جلا دو، تباہ کر دو۔ سانحہ 9/11 کے بعد بہت سے لوگوں کو صرف شک کی بناء پر اٹھا لیا تھا۔ اس ناول میں عصرِ حاضر کے تمام واقعات کو بخوبی بیان کیا ہے۔

اس ناول میں دو مرکزی کردار اوتار سنگھ اور انور خان ہیں، جو بچپن سے گہرے دوست تھے۔ لیکن ان کی دوستی میں اُس وقت خلل آیا جب تقسیم کے دوران فسادات پھوٹ پڑے۔ اس فسادات میں اوتار سنگھ نے انور خان کی بیٹی کو کرپان مار کر شہید کر دیا تھا۔ اوتار سنگھ یہ کرپان اُس کی عزت بچانے کے لیے مارتا ہے تا کہ اُس کے سامنے اُس کی عزت نہ لوٹی جائے۔ لیکن یہ واقعہ دونوں کے درمیان بدگمانی پیدا کر دیتا ہے۔ تقسیم کے بہت بعد پھر اچانک دونوں کی ایک دن بیساکھی کے میلے پر نیلا گنبد چوک میں ملاقات ہو جاتی ہے۔ دونوں سڑک پر ہی ایک دوسرے سے بہت سے سوالات، شکوئے کرتے ہیں، لیکن دونوں میں بدگمانی بہت جلد ختم ہو جاتی ہے۔ یہ دونوں کی عجیب وغریب دوستی کی مثال تھی۔

اس کے بعد دونوں دوست ایک دن موبائل پر بات کرتے ہیں۔ انور خان انڈیا کا پاکستان کو پانی بند کرنے سے بات شروع کرتا ہے۔ اور پھر دونوں سیاسی باتوں میں اس قدر کھو جاتے ہیں کہ اُن کو کچھ نہیں پتا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔ اسی طرح انور خان کہتا ہے کہ اگر تمہارے لوگ بعض نہ آئے تو ایٹم بم ہمارے پاس بھی ہے۔ اس پر اوتار سنگھ کہتا ہے کہ وہ انڈیا جا کر اُن کو سمجھائے گا۔ جس پر انور خان کہتا ہے جو کرنا ہے جلدی کرو، قصہ مکاو۔ اوتار سنگھ کہتا ہے کہ میں تمہاری بات سمجھ گیا ہوں بے شک قربانی دینا پڑے گی۔ اوتار سنگھ کہنا لگا کہ دربار صاحب کی اپچی پریا کا خاص آدمی ہوں میں وڈی میٹنگ میں یہ قصہ اٹھاوں گا۔ اس پر انور کہتا ہے کہ مجھے نہیں پتا، تو جانے تیرا کام جانے، یہ کام ہونا چاہیے۔ انور خان دوٹوک الفاظ میں کہتا ہے۔ اوتار سنگھ کہتا ہے کہ اگر بم چل گیا تو کچھ نہیں بچے گا، عورتیں، بچے، بوڑھے، شہر، سب کچھ راکھ ہو جائے گا۔ کیونکہ ہمارے دونوں کے پاس اکو جئے بمب ہیں۔

انجانے میں کی گئی ان باتوں کی وجہ سے دونوں کو ایک دن اٹھا لیا جاتا ہے۔ ان کو جس جگہ لایا گیا تھا وہاں اور بھی بہت سے بے گناہ لوگ تھے جن کو صرف نام نہاد شک کی بناء پر گرفتار کیا گیا۔ یونس جاوید لکھتے ہیں۔

انور خان کو آج نوواں دن تھا... جس بڑے دالان کے تاریخی ستون کی زنجیر سے

> اسے باندھ کر رکھا گیا تھا، وہاں تین فٹ کا ہی فاصلہ تھا جہاں آدمی ہل جل سکتا تھا ۔البتہ اتنی روشنی ضرور تھی کہ ہر چیز دکھائی دے رہی تھی ۔آج دروازہ کھلا تو ایک ایک کر کے بہت سے جلادنما کڑیل جوان اندر داخل ہو رہے تھے جن کے چہرے پتھر کے بے تاثیر، بے رحم، اور بدنما تھے ۔گزشتہ دو دنوں میں انہیں سے ملتے جلتے کئی لوگ اس سے بار بار سوال کر چکے تھے ...حالانکہ وہ فیصلہ پہلے سنا چکے تھے کہ "تم ٹیررسٹ تو ہو۔۔۔گروہ کون سا ہے؟لیڈر کون ہے؟مرکز کہاں ہے؟ یہ سوال وہ ہزار مرتبہ سن چکا تھا۔ انکار کرنے کے دوران تھپڑ بھی کھا چکا تھا مگر یہ سوال اس کا پیچھا نہیں چھوڑ رہا تھا۔ ہر کسی کے پاس ایک ہی سوال.ایک ہی دلیل۔۔۔ایک ہی طرح کے تھپڑ۔۔۔وہ انکار کرتے اور بار بار کہانی کہتے ہلکان ہو چکا تھا مگر ان کی تسلی نہ ہو رہی تھی ۔اس نے ہر کسی کے سوال کا جواب دیا، اس کے باوجود وہ سوال کیے جا رہے تھے۔(۲۱)

سانحہ 9/11 کے بعد پاکستان میں غیر یقینی صورتِ حال، مشکوک افراد، اس ناول کا موضوع ہے۔یعنی یونس جاوید کا یہ ناول پاکستان کی سیاسی تاریخ اور عصری واقعات کی حقیقتوں کا مظہر ہے۔

پانچواں ناول سرفراز بیگ کا پسِ آئینہ ہے جس کے پلاٹ میں سانحہ 9/11 کا ذکر بھی موجود ہے۔ جس میں راوی نے سانحہ 9/11 کا ذکر اور اس کے اثرات کو بیان کیا ہے ۔اس ناول میں 9/11 سے متاثر ہونے والی معشیت کا بھی نقشہ بھی بیان کیا گیا ہے۔ پوری دنیا میں مسلمانوں کو دہشت گرد سمجھا جانے لگا۔مغرب میں مسلمانوں کے گھروں چھاپے مارے جا رہے تھے، دوکانوں کی چیکنگ کی جا رہی تھی، ساری مغربی دنیا میں پاکستان کا امیج برے انداز سے پیش کیا جانے لگا، ایسا لگتا تھا کہ پاکستان میں صرف دو ہی آدمی ہیں ایک پرویز مشرف اور دوسرا اسامہ بن لادن ۔حالانکہ اسامہ بن لادن کا پاکستان سے کوئی تعلق نہ تھا۔نیائش خان اپنی کہانی بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> اس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے کچن کی دیوار پہ لکھا ہوا دکھایا۔وہاں کئی زبانوں میں کچھ لکھا ہوا تھا۔عربی میں بھی کچھ لکھا ہوا تھا۔میں نے پوچھا یہ کیا لکھا ہوا ہے

؟ کہنے لگا کہ میں عربی پڑھ لیتا ہوں لیکن سمجھ نہیں سکتا۔تو کہنے لگا کہ تم کس ملک کے ہو میں نے کہا پاکستان کہنے لگا کہ مشرف کا کیا حال ہے میں نے کہا مجھے اپنے حال کی خبر نہیں ہے اور تم مشرف کی بات کرتے ہو۔میرے لیے حیران کن امر یہ تھا کہ اُن لوگوں کو جیسے ہی پتا چلتا کہ کوئی پاکستانی ہے تو اس سے فوراً پوچھتے مشرف کا کیا حال ہے؟ اُسامہ بن لادن کہاں ہے؟ جیسے پاکستان میں ان دو کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے۔(۲۲)

چھٹا ناول ایم اختر کا ایک لو سٹوری اور ایک ایٹمی قیامت ہے۔جس کا موضوع جنوبی ایشیاء کے خطے جہاں پاکستان اور بھارت جیسی ایٹمی طاقت موجود ہیں کا مستقبل ہے۔یہ خطہ انسانی مسائل کا گنجینہ معنی سمجھا جاتا ہے۔اس ناول کے پلاٹ میں سانحہ 9/11 کے بعد پاکستان کے پہاڑی شہر ایبٹ آباد جو پاکستان کے وفاقی دارالحکومت اسلام آباد سے چند میل کے فاصلے پر واقع ہے،میں ایک کمپاونڈ جس میں اُسامہ بن لادن کی موجودگی کا خدشہ ہے،پر امریکی فوج کے کمانڈوز کا خفیہ آپریشن کا ذکر موجود ہے۔اس ناول کا راوی بیان کرتا ہے

یہ دومئی کا دن تھا جب پوری دنیا ایک دھماکہ خیز بریکنگ نیوز سے گونج اٹھی یہ بریکنگ نیوز پاکستان کے پہاڑی شہر ایبٹ آباد،جو وفاقی دارالحکومت اسلام آباد سے چند میل کے فاصلے پر واقع تھا،میں پیش آنے والے ایک واقعے کے بارے میں تھی۔مختلف نیوز چینلز پر نیوز الرٹ کے طور پر نشر ہونے والی اس خبر میں بتایا گیا تھا کہ امریکی فوج کے کمانڈوز نے ایبٹ آباد کے ایک کمپاونڈ میں ایک خفیہ آپریشن کے دوران القاعدہ کے سربراہ اُسامہ بن لادن کو ہلاک کر دیا تھا۔امریکی نیوی کے کمانڈوز اس کو گرفتار کرنا چاہتے تھے لیکن مزاحمت پر اسامہ بن لادن جاں بحق ہو گیا خبر کے مطابق امریکی کمانڈوز اس کی لاش کو لے کر کامیابی کے ساتھ چاپرز پر واپس اپنے اڈے کو چلے گئے جو افغانستان یا شاید پاکستان میں کہیں واقع تھا۔خفیہ آپریشن امریکی نیوی کے انتہائی مستعد کمانڈوز نے کیا جو''نیوی سیل'' کہلاتے تھے

۔یہ بھی اطلاع تھی کہ آپریشن کے دوران کمپاونڈ میں موجود کچھ دیگر لوگ بھی ہلاک ہوئے اور آپریشن میں شریک امریکی کمانڈوز کا ایک چاپر بھی کریش ہوا۔(۲۳)

آٹھواں ناول مرزا اطہر بیگ کا صفر سے ایک تک ہے جس کا موضوع تو کمپیوٹر سائنس کا استعمال ہے ،لیکن اس ناول کے پلاٹ میں سرسری طور پر سانحہ 9/11 کے بعد غیر ملکیوں کا اغوا کی طرف بھی اشارہ موجود ہے۔ اس ناول میں ایک فرانسیسی صحافی لڑکی کو اغوا کر لیا جاتا ہے جو اپنی صحافتی ذمہ داریوں کو نبھانے پاکستان آئی تھی ۔اس کا مرکزی کردار سائیبر سپیس کا منشی بیان کرتا ہے۔

میں واپس اپنے کمپیوٹر پر آتا ہوں اُس کھڑکی کے سامنے جو دنیا پر کھلتی ہے ایک بڑے نیٹ ورک کا ہوم پیج میرے سامنے ہے ۔خبروں کی کھڑکی بھی کھلتی ہے ۔دنیا کی تازہ ترین خبریں سامنے ایک ایک لائین میں لکھی ہیں یہ وہ کھڑکی ہے جسے ہر روز شاید میں درجنوں دفعہ دیکھتا ہوں ۔خبر ہے اُن کے بارے میں جو اب صرف آٹھ رہ گئے تھے ۔ایک لائین کی خبر ابھی صرف اتنا بتا رہی ہے کہ اُن کے بارے میں کوئی نئی پیش رفت ہے ۔ وہ پیش رفت کیا ہے ۔کیا وہ مکمل خاتمہ ہوسکتی ہے؟ میں نہیں جانتا ۔میرا کانپتا ہاتھ ماوس پر آتا ہے اور میں کرسر کو اُس لِنک پر لے جاتا ہوں ۔انگلی کی ہلکی سی کلِک اور پھر میں جان جاوں گا ....سب کچھ ....میں کلِلکرتا ہوں ۔(۲۴)

اردو شاعری اور فکشن موجودہ دور میں بھی پیش آنے والے نت نئے مسائل کا مبصر رہا ہے۔

سانحہ 9/11 کا واقعہ اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے مسائل جن میں عالمی سیاست میں تبدیلی ، تیسری دنیا کے مسائل ،افغانستان اور عراق پر حملہ ،وحشیانہ بمباری،فرقہ پرستی دہشت گردی ،اغوا،ٹارگٹ کلِنگ ،یورپی ملکوں اور معاشروں میں مقیم مسلمانوں سے نفرت انگیز رویے،انسانیت کی تذلیل،غیر یقینی صورتِ حال، آپریشنز،اچھے اور برے طالبان کی اصطلاح،مذہبی حلقوں کی بے چینی،معصوم لوگوں پر وحشیانہ بمباری،شہروں میں بم دھماکوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ ،باجوڑ اور سوات میں فوجی آپریشن ،اردو شاعری اور فکشن دونوں میں پوری طرح عیاں ہے ،جس سے اردو ادب کی اہمیت کا احساس اور بھی زیادہ ہوجاتا ہے۔

حوالہ جات

1۔ فرانسز فوکویاما، Francis Fukuyama، تاریخ کا خاتمہ، *The End of History*، مترجم: نورالدین انور، سٹی بک پوائنٹ، سن ۲۰۱۳ء، ص، ۳۶۵

2. Samuel P Huntington, *The Clash of Civilizatiions*, penguin books, new york, 1996, p, 33

3۔ (جان کے کولی) John k cooley غیر مقدس جنگیں *Unholy war*، مترجم: فرخ سہیل گوئندی، جمہوری پبلیکیشنز، سن ۲۰۱۲ء، ص، ۲۸

4۔ مجاہد کامران، پروفیسر، ڈاکٹر، *9/11& the new world order*، سانحہ ستمبر اور نیا عالمی نظام، مترجم: پروفیسر، ظفر الحسن پیرزادہ،، یونیورسٹی آف دی پنجاب، لاہور، سن، ۲۰۱۴ء، ص، ۴

5۔ ارون دھتی رائے، سرمایہ داریت، ریاستی جبر اور مزاحمت، مترجم، امجد نذیر سن ۲۰۱۲ء، ملتان، ص، ۵

6۔ نجیبہ عارف، (مرتب) 9/11اور پاکستانی اردو افسانہ، پورب اکادمی، اسلام آباد، سن، ۲۰۱۱ء، ص، ۶

7۔ غلام حسین ساجد ''ڈیزی کٹر'' مشمولہ: تسطیر، شمارہ19,20,21,22، اکتوبر2000 تا مارچ 2003ء، مدیر، نصیر احمد ناصر، لاہور، ص، ۲۱۷

8۔ آفتاب احمد شمیم، گیارہ ستمبر، مشمولہ، فنون، شمارہ 119، جنوری تا اپریل ۲۰۰۳ء، مدیر، احمد ندیم قاسمی، لاہور،، ص، ۱۲۰

9۔ وسواواشمبورسکا، گیارہ ستمبر کی تصویر، مشمولہ، دنیازاد، شمارہ ۳۴ء، مارچ ۲۰۱۲، مدیر، آصف فرخی، کراچی، ص، ۹

10۔ ثروت زہرا،ایک اور فتح کے بعد،مشمولہ،تسطیر ،شمارہ،19,20,21,22،اکتوبر،۲۰۰۱ء تا مارچ ۲۰۰۳ء، مدیر،نصیر احمد ناصر، لاہور،ص،۲۲۸،

11۔ ذی شان ساحل،جنگ کے دنوں میں ،آج،کراچی،سن،۲۰۰۳ء،ص،۱۱

12۔ احمد ندیم قاسمی،ظلمِ عظیم،سہ ماہی ،فنون،لاہور،شمارہ نمبر۱۲۰،مئی تا اکتوبر،۲۰۰۳ء،ص،۱۲۴

13۔ حسین مجروح''مرجینا کی واپسی''مشمولہ،دنیا زاد،شمارہ،جولائی،۲۰۰۸ء،مدیر،آصف فرخی، کراچی،ص۵۱

14۔ محمد حمید شاہد،مرگ زار،اکادمی بازیافت،کراچی،سن،۲۰۰۴ء،ص،۱۰۱

15۔ نجیبہ عارف،(مرتب)9/11اور پاکستانی اردو افسانہ،پورب اکادمی،اسلام آبا،سن،۲۰۱۱ء، ص،۴۱،۴۲

16۔ محمد حمید شاہد،مرگ زار،اکادمی بازیافت،کراچی،سن،۲۰۰۴ء،ص،۸۴

17۔ محسنہ جیلانی،بکھرے ہوئے لوگ،اکادمی بازتافت،کراچی،۲۰۰۳ء،ص،۸۸

18۔ مستنصر حسین تارڑ،خس و خاشاك زمانے،سنگِ میل پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۱۳ئص،۵۰۲س

19۔ مستنصر حسین تارڑ،قلعہ جنگی ،سنگِ میل پبلی کیشنز،لاہور،سن،۲۰۰۸ء،ص،۵۱،۵۲

20۔ محسنہ جیلانی،میں دہشت گرد ہوں؟شہرزاد،کراچی،سن،۲۰۰۸ء،ص،۴۱

21۔ یونس جاوید،ستونت سنگھ کا کالا دن،سنگِ میل پبلی کیشنز،لاہور،سن،۲۰۱۴ء،ص،۲۱

22۔ سرفراز بیگ،پسِ آئینہ،مثال پبلشرز،فیصل آباد،سن،۲۰۱۳،ص،۱۴۶س

23۔ ایم اختر،ایك لو سٹوری اور ایك ایٹمی قیامت،فکشن ہاوس،لاہور،سن،۲۰۱۴،ص،۳۲

24۔ مرزا اطہر بیگ،صفر سے ایك تك،سانجھ،لاہور،سن،۲۰۰۹،ص،۲۴

باب دوم

قلعہ جنگی اور خس و خاشاک زمانے کا تعارفی مطالعہ

ا۔ مستنصر حسین تارڑ: حیات و خدمات

ب۔ قلعہ جنگی کا تعارفی مطالعہ

ج۔ خس و خاشاک زمانے کا تعارفی مطالعہ

ا: مستنصر حسین تارڑ: حیات و خدمات

مستنصر حسین تارڑ ۱۹۳۹ء کو منڈی بہاوالدین کے ایک گاؤں جوکالیاں میں پیدا ہوئے۔ان کے والد رحمت تارڑ نے زرعی بیجوں کا ایک سٹور ''کسان اینڈ کمپنی'' قائم کیا جو بعد میں ایک وسیع اور منافع بخش کاروبار بن گیا۔

مستنصر حسین تارڑ نے ۱۹۵۴ء میں ''مسلم ماڈل ہائی سکول'' سے میٹرک کیا۔سکول کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد ۱۹۵۶ء گورنمنٹ کالج لاہور (جواب گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور ہے) سے انٹرمیڈیٹ کیا۔کالج کی تعلیم کے بعد مستنصر حسین تارڑ نے برطانیہ کے لیے رختِ سفر باندھا،جہاں پر اُن کا زیادہ وقت مطالعہ کرنے میں صرف ہوا۔ برطانیہ سے ٹیکسائل کورس مکمل کیا اور اس کے بعد لندن سے ''جنرل سرٹیفکیٹ آف ایجوکیشن'' کی ڈگری حاصل کی۔

۱۹۵۸ء میں مستنصر حسین تارڑ نے ماسکو کے''World Youth Festival''میں شرکت کی اور اس ساری داستان کو اپنی کتاب فاختہ میں بیان کیا۔ان کے ادبی سفر کی ابتداء کے حوالے سے ڈاکٹر محمد اشرف کمال اپنی کتاب اُردو ناول۔تاریخ و ارتقا(آغاز سے اکیسویں صدی تک) میں لکھتے ہیں:

سفر نامہ نگاری میں انھیں شہرت حاصل ہے۔پہلا سفر نامہ لندن سے ماسکو لکھا جو رسالہ قندیل میں چھپا۔سفر ناموں کے ساتھ ساتھ ان کے ناول بھی قارئین میں مقبول ہیں۔انھوں نے مختلف سفر کیے ہیں سیر و سیاحت میں بھی شہرت رکھتے ہیں۔سفر ناموں کے علاوہ دس سے زیادہ ناول لکھ چکے ہیں۔ا

سفر نامے اور ناولوں کے علاوہ مستنصر حسین تارڑ نے افسانے،ڈرامے،اور کالم نگاری میں بھی نام کمایا۔ اس کے علاوہ مستنصر حسین تارڑ نے کافی طویل عرصے ٹیلی ویژن پر میزبانی کے بھی فرائض انجام دیے۔ان کے سفر ناموں کی تفصیل اس طرح ہے:

نکلے تیری تلاش میں: اس سفرنامے کی وجہ سے مستنصر حسین تارڑ ادب میں متعارف ہوئے۔ان کا یہ سفر نامہ ماسکو یونیورسٹی کے نصاب میں بھی شامل کیا گیا ہے۔

اندلس میں اجنبی: اندلس کی تاریخ پر سفر نامہ۔

خانہ بدوش: بیروت سے روم تک کے سفر اور حالات کی داستان۔

پتلی پیکنگ کی: چین کے متعلق ایک دلچسپ سفر نامہ۔

نیپال نگری: نیپال کے متعلق سفر نامہ۔

سنہری اُلو کا شہر: ہندوستان کے شہر دہلی، آگرہ اور فتح پور سیکری کے پس منظر میں سفر نامہ۔

ماسکو کی سفید راتیں: سوویت یونین کے تناظر میں لکھا گیا سفر نامہ۔

الاسکا ہائی وے: کینیڈا کی ایک وادی کے متعلق سفر نامہ۔

منہ ول کعبہ شریف: سفر نامہ حج۔

غار حرا میں ایک رات: غار حرا میں ایک رات رہنے کی کہانی۔

پاکستان کے شمالی علاقہ جات کو متعارف کرانے والے سفر ناموں کی تفصیل:

ہنزہ داستان سفر شمال کے برفیلی بلندیاں چترال داستان

رتی گلی یاک سرائے شمشال بے مثال دیو سائی

سنو لیک کے ٹو کہانی

یاک سرائے اس وجہ سے اہمیت کا حامل ہے کہ اس میں مستنصر حسین تارڑ نے موت کو کردار بنا کر پیش کیا ہے۔

افسانے:

سیاہ آنکھ میں تصویر کوٹ مراد پریم

ٹی وی ڈرامے:

ہزاروں راستے فریب پرواز صاحب سرکار

کیلاش سورج کے ساتھ ساتھ

ناول نگاری کے فن کو مدِ نظر رکھا جائے تو مستنصر حسین تارڑ اکیسویں صدی کے عظیم ناول نگار ہیں ۔ان کے ناول تمام فنی لوازمات پر پورے اترتے ہیں ۔انھوں نے ناول کو نئے موضوعات،میلانات ،رجحانات،اورنئی تکنیک سے متعارف کرایا ہے۔ان کے ناولوں میں بہاؤ وقت اور پانی کے باعث مہدوم ہوتی ہوئی بستی کی داستان ہے۔قربت مرگ میں محبت ایک بوڑھا ادیب کی کہانی ہے جس پر تین عورتیں فریفتہ ہو جاتی ہیں۔اس ناول میں مصنف نے عورت کو نفسیات کی کسوٹی پر پرکھا ہے۔اے غزال شب میں کیمونزم کی داستان اور اس تحریک میں کرداروں کو پیش آنے والے مسائل کی داستان ہے ۔اس ناول کے اہم کرداروں میں وارث چوہدری،عارف نقوی،عارف مصطفٰی اسلام،اور ظہیرالدین اہم ہیں۔

ڈاکیا اور جولاہا میں مستنصر نے عورت کو جنسی تناظر میں بیان کیا ہے ۔راکھ میں میں سیاسی و سماجی تاریخ کو موضوع بحث بنایا ہے ۔قلعہ جنگی افغانستان پر امریکی حملہ کی داستان ہے۔خس وخاشاک زمانے میں ۱۹۳۰ء سے 9/11 کے فوراً بعد تک کی صورتِ حال کو بیان کیا ہے ۔مستنصر حسین تارڑ کے ناولوں پر تبصرہ کرتے ہوئے حمیرا اشفاق اپنی کتاب جدید اُردو فکشن عصری تقاضے اور بدلتے رجحانات میں بیان کرتی ہیں:

> ۔۔۔تارڑ نے لاہور شہر کی ثقافت کے حوالے سے ''راکھ'' جیسا ناول تخلیق کیا اور اس میں بھی وہ اپنے پرانے خیالات پر قائم رہے ''راکھ'' کے بعض حصوں میں ''بہاؤ'' کی بازگشت موجود ہے ۔تارڑ کے تازہ ترین ناولوں میں '' قربت مرگ میں محبت'' اور '' قلعہ جنگی'' شامل ہیں۔'' قلعہ جنگی'' افغانستان پر امریکی حملے کی کتھا ہے تو '' قربت مرگ میں محبت'' ایک رومانوی فرد کی داخلی داستان ہے ۔۲

مستنصر حسین تارڑ کے ناول موجودہ دور کے بہترین ناول ہیں جن میں موضوعات کا تنوع،عمدہ پلاٹ،تکنیک ،موثر کردار نگاری،اور عصری صورت حال کو موثر انداز سے بیان کیا ہے۔

اعزازات:

صدارتی تمغہ برائے حسن کارکردگی

تمغہ برائے ناول راکھ از وزیراعظم پاکستان

لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ برائے عالمی فروغ اُردو ادب (قطر)

سونے کا تمغہ برائے ادبی خدمات از ماسکو اسٹیٹ یونیورسٹی

پاکستان کے بیسٹ سیلر اُردو مصنف

ب: قلعہ جنگی کا تعارفی مطالعہ:

موضوع کے اعتبار سے قلعہ جنگی بہت اہمیت کا حامل ناول ہے۔ یہ ناول ۲۱۶ صفات پر مشتمل ہے اور ۲۰۰۳ء میں شائع ہوا تو فوراً ہی ادبی حلقوں میں مشہور ہو گیا۔ ناول آغاز سے اختتام تک دلچسپی اور ادبی چاشنی سے بھرپور ہے۔ اس ناول کے حوالے سے ڈاکٹر ممتاز احمد اپنی کتاب آزادی کے بعد اُردو ناول: ہیئت، اسالیب، اور رجحانات میں لکھتے ہیں:

> ''قلعہ جنگی''، مستنصر حسین تارڑ نے ۲۰۰۲ء میں پیش کیا ہے۔ یہ افغان جنگ کو پیش کرتا ہے جس کے پیچھے ایک تاریخ چلی آ رہی ہے جس کے ساتھ ایک خاص سیاست بھی جڑی ہوئی ہے۔ افغانستان کی جنگ پر جو طویل عرصے سے خاتمے کا نام نہیں لے رہی ہے ایک سے کہیں زیادہ ناول منظر عام پر آ جانا چاہیے تھے لیکن جیسا کہ ظاہر ہے کہ ناول افسانے کی نسبت زیادہ ریاضت اور لیاقت کا طالب ہوتا ہے اس لیے اس کی تخلیق میں وقت کا بڑا ہاتھ ہے۔ اس وقت دو ناول ایسے ہیں (کچھ اور بھی ہوں گے) جو قابل ذکر ہیں۔ مثال کے طور پر مستنصر حسین تارڑ کا ''قلعہ جنگی''، جس کا ماجرا اس جنگ کے حوالے سے متاثر کن ہی نہیں بلکہ سبق آموز بھی ہے اور ہم لوگوں کو بہت کچھ سوچنے پر بھی مجبور کرتا ہے۔[۳]

ڈاکٹر ممتاز احمد خان کی یہ بات درست ہے کہ قلعہ جنگی ہم لوگوں کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرتا ہے نہ صرف ہم لوگوں کو بلکہ تیسری دنیا کے تمام ممالک کو امریکہ کے مخفی مقاصد پر گہری غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔ اس بات میں بھی کوئی شک نہیں ہے کہ یہ ایک طویل جنگ ہے جس کا آغاز امریکہ اور روس کی سرد جنگ سے ہوا۔

اس طویل جنگ کے اثرات اُردو ادب پر شدت سے مرتب ہوئے ہیں۔

ناول کا انتساب بھی بڑا معنی خیز ہے۔اس انتساب میں ناول کا نچوڑ موجود ہے:

اُن افغانی بچوں کے نام جو بارودی سرنگوں کا شکار ہوکر اپاہج ہو گئے اور جو کسی فٹ بال میچ میں کھلاڑی نہیں ہو سکتے صرف گول کیپر ہو سکتے ہیں۔[۴]

ناول کے انتساب میں افغانستان کی تمام جنگی صورتِ حال کو انتہائی دلچسپ اور مختصر ترین لفظوں میں بیان کیا ہے۔اس انتساب سے افغانستان کی سیاسی،معاشی اور بحرانی کیفیت کی عکاسی ہوتی ہے۔انتساب پڑھ کر ناول پڑھنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

ناول کا عنوان افغانستان میں موجود جگہ قلعہ جنگی کے نام پر رکھا گیا ہے جو افغانستان کے شہر مزار شریف میں واقع ہے اور حضرت علیؓ کے مزار کی وجہ سے پوری دنیا میں مشہور ہے۔اس جگہ کو دوبارہ مزید شہرت سانحہ 9/11 کے بعد ملی۔ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی تباہی کے بعد امریکہ نے جنگی بیان بازی کا بازار گرم کر دیا اور اس ساری تباہی کا ذمہ دار اُسامہ بن لادن اور افغانستان کو قرار دیا۔افغانستان نے ثبوت مانگے جو امریکہ فراہم نہ کر سکا۔اس کے بعد امریکہ نے بے بنیاد الزامات کی بناء پر نام نہاد جنگ کا آغاز کر دیا۔جنگ کا آغاز بڑا ہی خوفناک انداز میں ہوا۔امریکہ نے دنیا کے کئی ترقی یافتہ مما لک کی مدد سے افغانستان پر حملہ کر دیا اور پہلے ہی دن افغانستان پر سو(۱۰۰) کروز میزائل فائر کیے۔اس حملے کا کوئی جواز نہ تھا۔افغانستان میں تو پہلے ہی لوگ انتہاء کی غربت اور بیماریوں سے مر رہے تھے۔جو ملک پہلے ہی کھنڈر تھا اس کو مزید کھنڈر بنانے کا کیا جواز تھا۔اس ساری جنگ میں افغانستان نے دفاعی پوزیشن کے ساتھ ساتھ گوریلہ جنگ کی حکمت عملی اختیار کی۔امریکہ اور اس کے اتحادی جدید ٹیکنالوجی کے باوجود کئی ماہ تک افغانستان میں داخل نہ ہو سکے اس لحاظ سے افغانستان کو اخلاقی برتری حاصل رہی اور اب سولہ سال پر مشتمل تباہی اور عام انسانوں کی ہلاکت کے بعد امریکہ افغانستان سے سوویت یونین کی طرح ناکام و نامراد ہوکر افغانستان سے انخلا چاہتا ہے۔

ناول کی کہانی کا پس منظر قلعہ جنگی کا واقع ہے جہاں پر سات مجاہدین نے افغانستان پر امریکی حملے کے دوران پناہ لی تھی۔امریکی فوجی اور شمالی اتحادیوں نے ہر قسم کے حربے استعمال کیے لیکن انہوں نے ہتھیار نہیں ڈالے۔اس واقعہ کی بنیاد پر مستنصر حسین تارڑ نے قلعہ جنگی ناول تخلیق کیا۔اس حوالے سے مصنف نے

اپنے ایک انٹرویو میں بیان کیا ہے:

> میرا سیاست سے کوئی تعلق نہیں۔شمالی اتحاد، طالبان سے کوئی واسطہ نہیں ،صرف انسان سے رشتہ ہے ۔انسانیت کے ناتے مجھے اس واقعے سے انتہائی اذیت پہنچی۔کشمیر،فلسطین،سبھی کو وہاں پر ہونے والے مظالم کا شدید دکھ ہے ،میں افغانستان کے متعلق بہت کچھ پڑھتا رہا،الیکٹرانک میڈیا،پرنٹ میڈیا، انٹرنیٹ، میں سبھی سے منسلک رہا۔میں خصوصی طور پر قلعہ جنگی کے متعلق ایک ایک بات جاننا چاہتا تھا۔اس کے متعلق معلومات حاصل کرتا رہا۔قلعہ جنگی میں قتل و غارت کے بعد معلوم ہوا کہ قلعہ کے تہہ خانے میں چھ سات طالبان ہیں جو ہتھیار نہیں ڈال رہے۔ان کو ہلاک کرنے کے لیے راکٹ،پانی،پیٹرول،گیس،سب کچھ چھوڑا گیا۔سارے طریقے استعمال کیے گئے ،دو تین دن کے بعد اس یقین کے ساتھ کہ اب ان میں سے کوئی بھی زندہ نہ بچا ہوگا ۔ریڈ کراس کی ٹیم لاشیں اٹھانے کے لیے آئیں تو ان پر فائرنگ کی گئی،جس سے معلوم ہوا کہ ان میں سے کوئی ایک ضرور زندہ ہے۔مجھے اس واقعے نے بہت فیسی نیٹ کیا۔۵

ناول قلعہ جنگی کا آغاز بحران سے ہوتا ہے۔جب امریکہ قتل و غارت کر چکا ہے،قلعہ جنگی کا صحن لاشوں سے بھرا ہوا ہے۔ہر جگہ پر انسانی اعضاء بکھرے ہوئے ہیں ۔جلے اور سڑے ہوئے جسموں کی بد بو ہے جس کی وجہ سے ماحول انتہائی تعفن زدہ ہے۔اسی قلعہ جنگی کے صحن میں موجود لاشوں پر ساتھ مجاہدین انتہائی زخمی حالت میں پڑے ہوئے ہیں۔امریکی بمباری کے بعد یہ مجاہدین کسی طرح اس قلعہ جنگی میں آکر پناہ لیتے ہیں۔یہ سب مجاہدین شدید زخمی ہیں،بھوک سے بھی ان کا برا حال ہے۔ان کے جسموں کے اندر بموں کے ٹکڑے موجود ہیں۔ ان کو اپنی موت کا مکمل یقین ہے کیونکہ ان میں سے کوئی بھی اس قلعہ سے باہر نہیں جا سکتا۔باہر نکلتے ہی ان پر B 52 کا عذاب نازل ہوسکتا ہے ۔اگر اس عذاب سے بچ بھی جائیں تو شمالی اتحاد والے ان کو کسی طرح بھی زندہ نہیں چھوڑ سکتے کیونکہ یہ لوگ ان کی سرزمین پر اپنے مقاصد اور خواب پورے کرنے آئے تھے ۔اس ساری صورتِ حال کو ڈاکٹر ممتاز احمد خان اپنی کتاب آزادی کے بعد اُردو ناول: ہیئت،اسلوب اور

رجحانات میں لکھتے ہیں:

> قلعہ جنگی'' کے موضوع کے لیے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اسے مستنصر حسین تارڑ نے نہ صرف سمجھ لیا ہے بلکہ بوجھ لیا ہے۔ یہاں دکھایا گیا ہے کہ قلعہ جنگی میں کچھ مجاہدین پھنس کر رہ گئے ہیں۔ان کا تعلق مختلف ملکوں سے ہے۔ یہ لوگ بھوک سے بے تاب ہیں ان کے پاس صرف ایک گھوڑا ہے جس کو کاٹ کر کھانے کی تجویز بھی سامنے آتی ہے، گھوڑا خود بھوکا ہے، ماحول تعفن زدہ ہے اگر یہ لوگ باہر نکلیں گے تو امریکن بمباری سے مارے جائیں گے، یوں یہ ایک عجیب سی صورت میں گرفتار ہیں۔ظاہر ہے کہ یہاں مکالماتی تکنیک ہی میں مختصر بیانیہ کے ساتھ ماجرے کی عکاسی کی جاسکتی تھی۔ یہ مکالمے کہانی کو آگے بڑھاتے ہیں اور ڈراؤنی صورتِ حال کی موثر وضاحت کرتے ہیں۔۶

اس قلعہ جنگی کے صحن میں ایک گھوڑا بھی ہے جو لاشوں کو سونگھ رہا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ گھوڑا بھی بھوکا ہے۔اس کے ہنہنانے کی آواز قلعہ جنگی میں محصور مجاہدین کے کانوں تک آتی ہے۔اس کے بعد تمام دوست آپس میں یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ اگر ہم گھوڑے کو پکڑ کر کسی طرح ذبح کر لیں تو ہم اس کو کھا سکتے ہیں۔گھوڑے کو کھانے کے ساتھ ہی حلال وحرام کا مسئلہ بھی درپیش ہے۔حلال وحرام کے مسئلے پر دو ساتھی آپس میں بحث کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> اور اگر ہم اس کو قابو کر کے تہہ خانے میں لے آئیں تو اسے کھا سکتے ہیں
>
> گھورا حلال ہوتا ہے؟
>
> اگر نہیں بھی ہوتا ہے تو کیا تم نہیں کھاؤ گے
>
> کھاؤں گا
>
> تم بتاؤ عبدالوہاب خادمین حرمین شریفین۔۔۔تم سے بہتر حلال وحرام کی تمیز کیسے ہو سکتی ہے
>
> مکروہ ہے۔۔۔لیکن حرام نہیں۔۔۔کھایا جا سکتا ہے۔۷

''گھوڑا'' کو مستنصر حسین تارڑ نے افغانستان کے علامتی تناظر میں پیش کیا ہے اور یہ علامت سارے ناول پر محیط ہے۔ اس کے بعد تمام ساتھی گھوڑے کو پکڑ نے قلعہ جنگی کے صحن میں جاتے ہیں اور اس پر فائر کرتے ہیں جس کے بعد گھوڑا ایک بھاری آواز کے ساتھ زمین پر گرتا ہے۔ زمین پر بھاری آواز کے ساتھ گرنا افغانستان پر حملے کو ظاہر کرتی ہے۔ گھوڑا کو مارنے کے بعد بھی وہ اس کو کھا نہ سکے اور اب گھوڑا بھی بالکل بے کار ہو چکا تھا۔ نہ حرکت کر سکتا تھا نہ ہی اپنی دم ہلا سکتا تھا۔ جس طرح افغانستان پر حملہ کرنے کے بعد بھی امریکی اپنے مقاصد میں کامیاب نہ ہو سکا وہ بھی گھوڑا کو مارنے کے بعد بھی نہ کھا سکے۔ اُن کے سامنے اب گھوڑا اس طرح پڑا ہوا تھا جیسے لکڑی کا بنا ہوا ہو۔ مستنصر حسین تارڑ لکھتے ہیں:

> گھوڑے کی ٹانگیں ایک عجیب سے زاویے پر اکڑی ہوئی تھیں ۔۔۔ جیسے لکڑی کا ہو کھلونا ہو اور کسی بچے نے اُسے گرا دیا ہو۔۔۔ ۸

یہاں پر بھی ''گھوڑا'' کو علامتی تناظر میں بیان کیا ہے۔ تہہ خانے کے اندر مردہ اجسام ہیں جو بے کار ہو چکے ہیں۔ یہ تہہ خانہ مردہ اجسام، بدبو، خون، پیشاب، لید سے مکمل طور پر بھرا ہوا ہے۔

جس طرح اس ناول کا آغاز بحران سے ہوتا ہے اسی طرح اس ناول کا اختتام بھی بحران پر ہوتا ہے۔ قلعہ کے اندر پانی چھوڑا گیا، راکٹ مارے گئے، گیس بھی چھوڑی گئی اور پٹرول بھی چھوڑا گیا لیکن کچھ دن بعد اس یقین کے ساتھ کے اب یہاں کوئی بھی زندہ نہیں بچا ہو گا ریڈ کراس کی ٹیم جب لاشیں اٹھانے آتیں ہیں تو اچانک اُن پر فائرنگ کر دی جاتی ہے، اُن میں سے ایک شخص تہہ خانے کے پانی میں آ کر گرتا ہے۔ مستنصر حسین تارڑ لکھتے ہیں:

> وہ بے خطر نیچے اترتے تھے۔ جب عبدالحمید جان واکر کے مر چکے منجمد بدن کی آنکھوں کے علاوہ ایک انگلی بھی زندہ ہو گئی جو لبلبی پر تھی، اسے دبانے میں پہروں لگ گئے، بالآخر وہ دب گئی۔ گولیوں کی باڑ نے سیڑھیوں کا پلستر ادھیڑ دیا اور ان میں سے دھول بلند ہوئی اور اس دھول میں کوئی زخمی ہو کر گرا اور لڑھکتا ہوا نیچے پانی میں آ گرا۔۔۔ شٹ۔۔۔ کسی نے امریکی لہجہ میں تھوکا۔ ادھر تو اب بھی کوئی ہے ۔۔۔ ہاں ۔۔۔ میں ہوں ۔۔۔ ڈونٹ کم داؤن آر آئی وِل شوٹ۔ ۹

اس کے بعد دوبارہ قلعہ پر راکٹ مارے جاتے ہیں شدید فائرنگ ہوتی ہے اور تہہ خانے میں ایک زوردار دھما کا ہوتا ہے جس کے بعد عبدالحمید جان واکر بھی پہچان کے جہان سے دور جا چکا ہوتا ہے، پانی پر لاشیں تیرتی پھر رہی ہیں، گھوڑا بھی کبھی پانی میں ڈبکی کھا کر نیچے چلا جاتا ہے اور کچھ دیر بعد پھر سے پانی کی سطح پر ابھر آتا ہے۔

قلعہ جنگی امریکی حملے کی مکمل داستان ہے۔ناول میں افغانستان کی صورتِ حال،لوگوں کی اذیت ناک حالت، سیاسی نظریات، جنگ کا آغاز،لوگوں کا طالبان کے ساتھ شامل ہونا ،جہاد، بڑی طاقتوں کے مقاصد، بمباری سے پیدا ہونے والی ہولنا کی،اس جیسے سب سوالات کے جواب بھی مل جاتے ہیں ۔اس لیے قلعہ جنگی بھرپور سیاسی ناول ہے۔اس پر بات کرتے ہوئے ڈاکٹر ممتاز احمد خان اپنی کتاب آزادی کے بعد اُردو ناول:ہیئت، سلوب اور رجحانات، میں رقم طراز ہیں:

> یہ سیاسی رجحان کا ناول ہے۔یہاں کئی سوالات اٹھائے گئے ہیں جیسے جہاد کا مستقبل کون صحیح ہے اور کون غلط؟عوام کو سزا کیوں ملتی ہے؟جنگ کا نتیجہ کیا ہے ؟بڑی طاقتوں کے کھیل میں اصل نقصان کس کا ہوتا ہے ۔اس قسم کی جنگ کی ہولنا کی اور انفرادی واجتماعی المیے! تارڑ نے ایک بڑے Dilemma کو آشکار کیا ہے۔۱۰

ایک اچھے اور تخلیقی ناول کے لیےضروری ہے کہ ناول کا پلاٹ بھی اچھا اور عمدہ ہو۔پلاٹ میں واقعات کی ترتیب کا سلیقہ پلاٹ کو دلکش اور جاذبِ نظر بنا دیتا ہے۔پلاٹ میں سے ایسے واقعات کو نکال باہر کرنا چاہیے ہے جن کا قصّہ سے کوئی تعلق نہ ہو یعنی پلاٹ کا قصّے کے مطابق ہونا ضروری ہے۔قلعہ جنگی کا پلاٹ اس فنی حسن سے بھرپور ہے۔اس ناول کا پلاٹ ایک سچے واقع پر مشتمل ہے۔افغانستان پر حملے کے وقت مزار شریف کے قلعہ جنگی میں سات مجاہدین نے پناہ لی۔شمالی اتحاد والوں نے ہر حربہ استعمال کر لیا لیکن انہوں نے ہتھیار ڈالنے سے انکار کر دیا۔قلعہ جنگی کے اندر زہریلی گیس چھوڑی گئی،میزائل مارے،پانی بھی چھوڑا گیا لیکن چند دن کے بعد اس یقین کے ساتھ کے اب ان میں سے کوئی بھی زندہ نہ بچا ہوگا ریڈ کراس کی ٹیم لاشیں اٹھانے آئی تو ان پر فائر کیا گیا۔اسی واقع پر قلعہ جنگی کا پلاٹ تیار کیا گیا ہے۔

ایک اچھے پلاٹ کی یہ خوبی بھی ہے پلاٹ شروع سے ہی دلچسپی کا باعث ہو یعنی پلاٹ شروع سے ہی

گہری معنویت رکھتا ہو۔ یہ خوبی بھی اس ناول میں موجود ہے۔ناول کا آغاز قلعہ جنگی کے صحن میں گھوڑے سے ہوتا ہے جس کی وجہ سے قاری کی توجہ فوراً ناول کی طرف مرکوز ہو جاتی ہے کہ اس صحن میں گھوڑا کہاں سے آیا ہے لیکن جب قاری کو معلوم ہوتا ہے کہ یہ جگہ افغانستان میں ہے جہاں پر امریکہ نے بمباری کی ہے اور ایک گھوڑا لاشوں کو سونگھ رہا ہے تو یہ قاری کے لیے بڑی فکر انگیز معنویت بن جاتی ہے۔

پلاٹ کا ایسے واقعات پر مشتمل ہونا ضروری ہے جو پہلے پیش آ گئے ہوں اس لحاظ سے بھی قلعہ جنگی کا پلاٹ نہائیت موزوں ہے کہ یہ واقع پہلے افغانستان میں پیش آ چکا ہے۔

قلعہ جنگی کے پلاٹ کا پہلا حصّہ گھوڑے کو دیکھنے سے لے کر اس کو مارنے تک ہے۔اس کے بعد اس کے کھانے، نہ کھانے اور حلال وحرام کا ہے۔اس کے بعد کرداروں کی حرکات وسکنات بہت اہمیت کی حامل ہے جن پر خارجی اثرات مرتب ہیں۔ان واقعات کی ترتیب سے یہ واضع ہوتا ہے کہ ناول کا پلاٹ بحرانی صورتِ حال سے شروع ہوتا ہے اور بحرانی صورت حال پر ہی اختتام پذیر ہوتا ہے۔

کسی فن پارے میں اُسلوب کی اہمیت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔اگر قصّے کو اچھے اُسلوب کے ساتھ نہ بیان کیا جائے تو اچھے سے اچھا قصّہ بھی اپنی کشش برقرار نہیں رکھ سکتا۔اس بات میں شک نہیں کہ اُسلوب مصنف کا دوسرا نام ہے، یعنی اُسلوب کو ایسا ہونا چاہیے ہے کہ اس میں مصنف کی شخصیت نظر آئے۔مستنصر حسین تارڑ کے تمام ناول اس فنی تجربے کی عمدہ مثال ہیں۔یہ خوبی بھی مستنصر حسین تارڑ کو ہمعصر ناول نگاروں سے الگ شناخت عطا کرتی ہے۔

اُسلوب کو ابھارنے کے لیے ضروری ہے کہ مصنف کو واقعہ اور اس کا پس منظر یا روایت کا بھی گہرا شعور ہو اس کے بغیر اس فنی تجربے سے انصاف نہیں کیا جا سکتا۔قلعہ جنگی کا اُسلوب اس لحاظ سے اہمیت کا حامل ہے کہ مستنصر حسین تارڑ نے افغانستان پر امریکی حملے کو بہت گہرائی سے محسوس کیا ہے اور سوویت یونین کی سرد جنگ سے سانحہ 9/11 تک کی ایک ایک کڑی سے مستنصر حسین تارڑ خوب واقف ہیں اس وجہ سے قلعہ جنگی کا اُسلوب متاثر کن ہے۔

قلعہ جنگی کو امریکی جنگی عزائم اور اس موجودہ دور میں امریکہ کا کردار کے تناظر میں دیکھا جائے تو مستنصر حسین تارڑ کا اُسلوب بیان توضیحی، دلچسپ اور پُر تاثیر خصوصیات کا حامل ہے۔قلعہ جنگی میں

علامتوں کا استعمال بھی اُسلوب کو نمایاں کرتا ہے۔ ناول کا عنوان افغانستان کی مظبوطی اور مزاحمت کو ظاہر کرتا ہے اور ''گھوڑے'' کو افغانستان کے علامتی پس منظر سے قلعہ جنگی کو مزّین کیا گیا ہے۔

مستنصر حسین تارڑ نے عالمی ادب کا بھی وسیع مطالعہ کر رکھا ہے جس کا عکس قلعہ جنگی میں بھی عیاں ہے اس وجہ سے قلعہ جنگی کے اُسلوب پر اس کے اثرات واضح طور پر مرتب ہوئے ہیں۔ ''چار مرغابیوں کا خوشی سے کوئی تعلق نہیں'' جیسے استعاراتی پیکر عالمی ادب کی دین ہے جسے قلعہ جنگی کے اُسلوب کا حصّہ بنایا گیا ہے۔

قلعہ جنگی کا مطالعہ ہمیں حقیقت پسند ہونے کا بھی درس دیتا ہے۔ اگر یہ واقع ساٹھ یا ستّر کی دہائی میں ہوتا تو ہم ضرور بہت سی توہمات اور قیاس آرائیاں بھی سنتے جن کو مذہب کی بنیاد پر بیان کیا جاتا اور یہ کہا جاتا کہ امریکہ افغانستان سے اس لیے پسپائی اختیار کر گیا کہ جب امریکہ کی افواج کی طرف سے کوئی میزائل یا بم فائر کیا جاتا تو کوئی سفید رنگ کے کپڑوں میں ملبوس بزرگ اپنے ہاتھوں سے میزائل اور بموں کو دوبارہ امریکی افواج کی طرف پھینک دیتے لیکن اس بار جدید ٹیکنالوجی نے فرشتوں اور نورانی بزرگوں کی غیبی امداد کا رستہ روک لیا۔ اس وجہ سے قلعہ جنگی کے اُسلوب بیان پر حقیقت پسندی کا عنصر حاوی ہے اور اس اُسلوب کے ساتھ یہ پیغام دیا ہے کہ ہمیں اس قسم کی قیاس آرائیوں سے نکل کر ہوش مندی، سماجی علوم اور جدید ٹیکنالوجی سے اپنا نصب العین متعین کرنا ہوگا۔ اس بنیاد پر اگر مستنصر حسین تارڑ کو سر سید احمد خان کا پیشترو کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ قلعہ جنگی کے اُسلوبیاتی مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ مستنصر حسین تارڑ نے ایک نیا اُسلوب بیان وضع کیا ہے۔

قلعہ جنگی میں غیر ملکی کردار بھی موجود ہیں۔ سانحہ 9/11 سے پہلے یہ تمام کردار شاندار زندگی بسر کرتے تھے۔ ان کو دنیا کی ہر سہولت میسر تھی۔ ان غیر ملکی کرداروں عبدالوہاب خادمین حرمین شریفین ہیں جن کا تعلق سعودی عرب سے ہے۔ کیمبرج سے علم الانسان کی ڈگری نمایاں پوزیشن میں حاصل کی۔ ان کے اعلٰی تعلیم یافتہ ہونے پر یورپی اساتذہ بھی حیران ہوتے تھے۔ اس کردار کے بہت سے بہن بھائی تھے جن کے نام اُن کے والد بھی نہیں جانتا تھے۔ عبدالوہاب اُس وقت طالبان میں شامل ہوا جب افغانستان پر روس نے حملہ کر دیا۔

قلعہ جنگی کا ایک اور غیر ملکی کردار ہاشم میر ہے ان کا تعلق برطانیہ سے ہے۔ اُن کے والد سمگلر ہو کر

برطانیہ آئے تھے۔اُس کا ذہن بھی برطانوی سوچ کا حامل تھا۔اُن کے والد نے ان کی تعلیم پر کافی پیسے خرچ کیے،اُس کی تمام ضروریات کا خیال رکھا۔ان کو اے لیولز میں پانچ ایز ملنے پر لندن سکول آف اکنامکس میں داخلہ بھی ہو گیا۔ہاشم میر اپنے ایک سعودی دوست ال منصور کے کہنے پر جہاد میں شامل ہوا۔

قلعہ جنگی کا ایک اور غیر ملکی کردار عبدالحمید جان واکر ہے۔ان کا تعلق امریکہ سے ہے۔ان کے پاس دنیا کی ہر سہولت موجود تھی۔ایک قیمتی گھوڑا تھا،ایک سپورٹس کار تھی جس میں اکثر ایک خوبصورت ، بھرے بدن اور لمبی ٹانگوں والی لڑکی بیٹھی ہوتی۔ان کے پاس بہترین شراب اور ہیروئن میسر ہوتی تھی۔لیکن اپنی زندگی سے مطمئن نہ تھا اور پھر ایک دن اُس نے اپنے والد سے کہا کہ اُس نے اپنا آبائی عقیدہ چھوڑ کر اسلام قبول کر لیا ہے۔اس کے بعد عبدالحمید جان واکر امریکہ جیسا ملک کو چھوڑ کر افغانستان میں آ گیا اور طالبان کا ساتھی ہو گیا۔

ابو طالب چی چی بھی ایک غیر ملکی کردار ہے۔ان کا تعلق چیچنیا سے ہے اور اسی وجہ سے اس کے دوست ان کو چی چی کہتے تھے۔ان کا گاؤں داغستان کی سرحد کے پاس تھا۔ان کی ابتدائی تعلیم وادی کی ایک مسجد سے ہوئی۔ان کی دادی ان کو داغستان کے شاعر رسول حمزہ کی نظمیں سنایا کرتی تھیں۔ابو طالب چی چی اپنی دادی کے کہنے پر جہاد میں شامل ہوا۔

قلعہ جنگی کا اہم کردار اللہ بخش ہے۔ان کا تعلق پاکستان سے ہے۔اللہ بخش کے گھر والوں کا پیشہ میراثی پن تھا۔ان کے گھر والے گاؤں کے چوہدریوں کا حقہ بھرنا اور جگتیں کر کے اُن کا دل بہلانا تھا اس وجہ سے مانگنے تانگنے کا کام بھی جاری رہتا۔اللہ بخش ایک بونے کے کہنے پر جہاد میں شامل ہوا۔

قلعہ جنگی کا دوسرا اہم کردار مرتضٰی بیگ کا ہے۔وہ چوری چھپے افغانستان آ کر طالبان میں شامل ہوا۔ان کے والد بھی سوویت یونین کے وقت چوری چھپے افغانستان آیا کرتے تھے۔مرتضٰی بیگ ایک نائی کے ساتھ افغانستان آیا تھا اور طالبان میں شامل ہو گیا۔

قلعہ جنگی کا ایک اور کردار گل شیر ولی ہے اس کا تعلق پاکستان کے قبائلی علاقہ دِیر سے ہے۔دِیر میں ان کے والد ایک نواب کے اصطبل میں گھوڑوں کی لید صاف کیا کرتا تھا۔اس کی ماں نے اپنی بیٹیوں کا اس لیے بیچ دا تھا تا کہ کچھ دن کا کھانا میسر ہو جائے۔گھر میں غربت کی نحوست بہت زیادہ تھی۔ان کے گھر میں صابن بھی نہ ہوتا تھا اور نہ ہی پاؤں میں کوئی پہننے والی چیز ہوتی۔گل شیر ولی ایک مولوی کی باتوں سے متاثر ہو کر

مدرسہ آ گیا جہاں ان کو زندگی میں پہلی بار تین وقت کی روٹی ملی،سونے کو چار پائی ملی،مفت دینی تعلیم اور ہتھیاروں کے استعمال کی ٹریننگ کے بعد افغانستان بھیجا گیا۔

قلعہ جنگی کا مرکزی تھیم افغانستان پر امریکی حملہ ہے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ کس طرح افغانستان پر نام نہاد جنگ کا آغاز ہوا۔اس کے ساتھ اس ناول میں یہ بھی بتانے کی کوشش کی ہے کہ طالبان میں لوگوں کی شمولیت کس طرح ہوئی، اس میں لوگوں کی شمولیت کے اسباب کی بھی نشاندہی کی گئی ہے ۔ناول کا عنوان افغانستان کی مظبوطی اور مزاحمت کو ظاہر کرتا ہے۔افغانستان پر شروع دن سے ہی بڑی اور غیر ملکی طاقتوں نے زور آزمائی کی ،طاقت اور جدید ٹیکنالوجی کی بنیاد پر افغانستان پر اپنا تسلط قائم کرنے کوشش کی لیکن کوئی غیر ملکی طاقت بھی اپنے مخفی ،مادی اور سیاسی مقاصد میں کامیاب نہ ہوسکی۔ناول کی صورت میں مستنصر حسین تارڑ نے امریکی بربریت کو ہمیشہ کے لیے محفوظ کرلیا ہے تاکہ آنے والی نسلیں امریکی جارحیت کو فراموش نہ کرسکیں۔

ج: خس وخاشاک زمانے کا تعارفی مطالعہ

خس وخاشاک زمانے مستنصر حسین تارڑ کا ایک بڑا ادبی شاہکار ہے۔اس ناول میں تاریخ کے بہت سے واقعات کو بیان گیا ہے جن کو بہت سارا وقت گزرنے پر بھی ہم بھول نہ سکے۔اس ناول میں انسانی زندگی پر وقت کے منہ زور بہتے دریا کے اثرات کو بیان کیا گیا ہے۔اس سے پہلے بڑے کینوس کے اور بھی ناول منظرِ عام پر آئے جن میں قراۃ العین حیدر کا آگ کا دریا، عبداللہ حسین کا اداس نسلیں شمس الرحمٰن فاروقی کا کئی چاند تھے سر آسماں ،مرزا اطہر بیگ کا غلام باغ ،عبیداللہ بیگ کا راجپوت قابلِ ذکر ہے۔لیکن سابقہ ناولوں میں سے کوئی خس و خاشاک زمانے کے مقابلہ کانہیں ۔خس وخاشاک زمانے اپنے موضوع، پلاٹ، وقت،تاریخ،تکنیک،اُسلوب اور کردار نگاری کی بناء پر منفرد ناول ہے اور ایک ایسی تاریخی دساویز کی بھی ضرورت تھی جس میں مسلمانوں کی تاریخ کے تمام پہلوؤں کو وقت کے ساتھ ساتھ بیان کیا گیا ہو۔اس بناء پر دیکھا جائے تو ناول کا عنوان بھی اچھوتا ہے جو گزرے ہوئے وقت کی نشاندہی کرتا ہے ۔یہ ناول ۲۰۱۰ء میں شائع ہوا اور فوراً ہی ادبی حلقوں میں بھونچال آ گیا۔

اول کا تعارف کراتے ہوئے ڈاکٹر ممتاز احمد خان اپنی کتاب اُردو نـاول کـے چـنـد اہـم زاویے :اضافوں کے ساتھ میں رقم طراز ہیں:

> Mustansar hussain Tarar is a well known novelist who has,to his credit,novels like raakh,Bahao,Qurbat-e-Marg main mohabbat,Dakia aur Jolahaa,and latest being Khaso Khaashak Zamanay,which covers vicissitudes and short lived pleasures of the people of the Sub-continent during the last couple of decades. He has travelled deep into their lives to trace their traditions, vanishing values,positive and negative attitudes and their questionable mindset which has been plagueing them ever since the downfall of the mughal dynasty.11

قلعه جنگی کے انتساب کی طرح خس و خاشاك زمانے کا انتساب بھی بڑا معنی خیز اور فکر انگیز ہے۔ناول کا انتساب نئے آدم کے نام ہے۔اس انتساب کے اندر ناول کا مکمل مفہوم موجود ہے۔یہ انتساب ایک مکمل استعارہ ہے جس سمجھنے کے لیے گہری سیاسی،تاریخی،سماجی،تہذیبی اور علمی ادبی بصیرت درکار ہے۔

ناول کا آغاز نور بیگم کے گھر سے ہوتا ہے۔نور بیگم نے بہت سے مرغیاں اور مرغے پال رکھے تھے جو آہستہ آہستہ اپنی زندگیاں پوری کر کے اس جہاں سے جا چکے ہیں۔ان کے پاس اب صرف ایک ہی مرغ بچا تھا وہ بھی قریب المرگ ہے اور صرف چند دیر کا مہمان ہے۔نور بیگم کا چچا بخت جان بھی موقع پر موجود ہے جس نے اس سے پہلے بھی نور بیگم کی مردہ مرغیوں کو کوڑے کے ڈھیر سے اٹھا کر کھا چکا ہے۔بخت جان اپنی بھتیجی نور بیگم کی منت سماجت کر رہا ہے کہ اگر وہ اس مرغ کو مجھے دے دے تو میں اسے اپنی خوراک کا حصہ بنا سکتا ہوں جس سے میرے بدن میں چند دن کی اور طاقت آسکتی ہے۔

یہاں پر مستنصر حسین تارڑ نے فلیش بیک کی تکنیک کا استعمال کیا ہے۔بخت جان کو اپنی بھتیجی سے مرغ کی بھیک مانگتے ہوئے دکھایا گیا ہے جبکہ بعد میں اس کی جوانی،طاقت،ریاکاری اور بدکاری کو بیان کیا گیا ہے۔قریب المرگ مرغ اور بخت جان کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

> صاحب بہار دبشکل قائم چوکھٹ کے پار اپنی زرد آنکھوں سے اُس شخص کو تکتا تھا جو اُس کے مسمار ہو جانے کا تمنائی تھا۔۔۔کہ کب وہ ڈھیر ہو جائے اور نور بیگم سے التجا کرے کہ تم میرے سگے بھائی محمد جہان نمبردار کی آخری بیٹی ہو تو ہمیشہ کی مانند

میرا اپنے سگے چاچا کا اتنا لحاظ تو کرو کہ ایک مرا ہوا مرگ رُوڑھی پر۔۔۔کسی گندگی
کے ڈھیر پر پھینکنے کی بجائے مجھے عنایت کر دو۔۱۲

ناول میں دنیا پور، کوٹ مراد، نت کلاں اور کوٹ ستارہ گاؤں کے لوگوں کی عکاسی کی ہے۔ یہاں پر کرداروں کی ایک دنیا آباد ہے جن کے اپنے طور طریقے اور اندازِ زندگی ہے۔ انہی لوگوں میں ایک گھرانہ محمد جہان نمبردار کا ہے جس کے بہت سے گھر والے اس دنیا سے جا چکے ہیں۔ نور بیگم محمد جہان کی آخری بیٹی ہے جس کو مرغے پالنے کا شوق ہے۔ بخت جہان کے دوست لہناں سنگھ کی بیوی امرت کور ہے جو بعد میں بخت جہان سے شادی کر لیتی ہے اور اپنا نام کنیز فاطمہ رکھ لیتی ہے۔ امرت کور کے دو بیٹے گوبند اور نونہال ہیں وہ بھی مسلمان ہو کر اپنا نام فتح محمد اور غلام محمد رکھ لیتے ہیں۔ انھوں نے مذہب بھی اس لیے بدلہ تھا کیونکہ وہ اپنی ماں سے الگ نہ ہو سکتے تھے۔ لیکن آخر کار اُن کو اپنی ماں سے دور ہونا پڑا۔ فتح محمد تو گوجرانوالہ پہنچ کر فوج میں بھرتی ہو جاتا ہے جبکہ دوسرا بھائی ایک ڈکیت بن جاتا ہے۔

نور بیگم کی شادی لاہور میں سفید بالوں والے اور دیہات سے نکل کر تعلیم حاصل کرنے والے امیر بخش سے ہوتی ہے اور ایک لڑکل روشن بخش کی ماں بنتی ہے۔

کنیز فاطمہ کی ایک بیٹی صاحباں مسخ چہرے، اور کچلے ناکارہ ٹیڑھے بدن کے ساتھ پیدا ہوتی ہے۔ اس کی ٹانگیں سکڑی ہوئی ہیں اور پست پر ایک کوہان ہے۔ وہ اپنی ایسی پیدائش پر خدا سے بھی شکوہ کرتی ہے کہ مجھ کو اس حال میں پیدا کرنے کا جواز کیا تھا۔

اسی گاؤں کا ایک اور کردار اچھو شیخ بھی ہے جو ہر وقت خودکشی پر مائل رہتا ہے اور کوڑے کے ڈھیٹر سے کانچ اٹھا کر اس کو اپنے گلے پر اس وقت تک پھیرتا جب تک اس کے گلے سے خون نہ نکل آتا۔

مائلو کی شادی کی بارات بھی اسی دنیا پور کے گاؤں سے روانہ ہوئی تھی جن کی شادی امام بخش سے طے پائی تھی۔ لیکن شادی کے چند دن بعد ہی ان کی سوکن حیات بی بی نے دودھ میں زہر ملا کر دے دیا۔ اُس کی موت کے بعد امام بخش نے مائلو کی قبر کے پاس ایک چھپڑ بنا کر رہنے لگا لیکن پھر اچانک ایک دن وہاں سے اٹھا اور کنگن پور کی مشہور بد نامِ زمانہ طوائف شیداں پانڈوں والی سے نکاح کر کے گھر لے آتا ہے تاکہ حیات بی بی ساری عمر تڑپتی رہے۔ لیکن حیات بی بی تین سال بعد سودائن ہو جاتی ہے اور اس کے بعد امام بخش بھی شیداں کو

پاؤنڈوں سے بھر کر طلاق دے دیتا ہے اور اس کے بعد امام بخش خودکشی کر لیتا ہے۔

دنیاپور ہر قسم کے لوگوں سے آباد ہے، ان کرداروں کی زندگی میں بھی نشیب و فراز جاری ہے فوت بھی ہو رہے ہیں اور نئے لوگ بھی آ رہے ہیں۔شادی بیاہ کی رسمیں بھی جاری ہیں۔کوئی چیز بھی مستنصر حسین تارڑ نظر انداز نہ کر سکے۔شادی کی ایک رسم کے حوالے سے بیان کرتے ہیں:

> اُس روز پوری برادری کی بھینسوں کا دودھ گھر نہیں جاتا تھا، چوپال یا دارے میں اُترے ہوئے باراتیوں کی مدارات کے لیے جاتا تھا۔کئی روز پیشتر دلہن والے برادریوں کے گھروں سے چارپائیاں اور بستر اکٹھے کرنے لگتے تھے۔۔۔تب ایک چوہدرانی کے لیے سب سے پُرفخر وہ لمحہ ہوتا تھا جب وہ پچھلی کوٹھڑیوں میں سے نیچے اُوپر رکھی نواری رانگلے پایوں والی متعدد چارپائیاں اور اُن پر تہہ شدہ درجنوں بستر برآمد کر کے دلہن کے گھر والوں کو پیش کر دیتی تھیں اور وہ شکر گزار ہو کر کہتے تھے چوہدرانی پورے گاؤں میں سب سے زیادہ اور نویں نکور بستر تمہارے گھر سے نکلے ہیں سب کے ہاں سے بان کی چارپائیاں برآمد ہوئیں ہیں پر تو نے ایک نہیں اکٹھے تین نواری پلنگ ہمارے آگے بچھا دیئے ہیں۔۔۔وہ چوہدرانی مدتوں اس گھمنڈ میں مبتلا برادری کے دوسرے لوگوں کو ایک چشم حقارت سے دیکھتی رہتی تھی۔۱۳

ناول میں کوٹ سیداں گاؤں کا بھی ذکر ہے جہاں کے لوگ زیادہ تر سید کہلاتے تھے اور نذر نیاز پر گذر اوقات کرتے تھے۔یہ گاؤں دنیاپور سے ایک دن کی مسافت پر واقع ہے۔اس ویران گاؤں میں ایک کچے گھر میں کرم داد اور مولاداد بھی ہیں جو سارے دن سوتے ہیں اور رات کو کھیتوں سے چوری چھپے شلغم مولیاں کھا کر گذارا کرتے ہیں۔

کہانی اب ایک نیا موڑ لیتی ہے، محمد جان ایک ویرانے میں کنواں کھدواتا ہے تاکہ اس ویرانے بھی بہار آجائے اور اس بہانے سے مستقبل کا بھی کچھ سامان ہو جائے گا۔کدالوں کی دھک دھک نیچے زمین میں جا کر کیڑے مکوڑوں کو بے چین کرتی تھی۔یہاں پر ایک عجیب بات یہ ہوتی ہے کہ اس کنواں سے بہت سے بونے نکل کر کھیتوں میں غائب ہو جاتے ہیں۔یہاں پر مستنصر حسین تارڑ نے بلیغ استعارے سے کام لیا ہے۔

کدالوں کی دھک دھک تقسیم کے خوف کی علامت ہے جبکہ کنواں سے نکلنے والے بونے اُن لوگوں کی طرف اشارہ ہے جو مصلحتاً تحریک پاکستان میں شامل ہوکر پاکستان بننے کے بعد اقتدار پر قابض ہو گئے ۔ یہ بونے محمد جان کے بھائی بخت جان سے کہتے ہیں :

چوہدری ہم نے کہیں دفع دور نہیں ہونا ۔۔۔ہم راج کرنے کے لیے آئے ہیں ۔اُن میں وہ بونا جو بہت ہی بونا تھا بولا ''جب تاریخ کٹ پھٹ جائے گی ،جغرافیے ادھڑ جائیں گے تب ۔۔۔خلق خدا نہیں ہم ۔۔۔ہم بونے راج کریں گے'' ۔۱۴

محکم دین کے بیٹے امیر بخش نے جب سکول میں داخلہ لیا تو برادری والوں نے ان پر طعنے کسنے شروع کر دیے ۔ لیکن آخر کار امیر بخش میٹرک پاس کر لیتا ہے ۔اس کی ماں اپنے بیٹے کو اپنی برادری کے ایک تھانیدار کے پاس نوکری حاصل کرنے کے لیے بھیج دیتی ہے جہاں پر تھانیدار اُن کے پیچھے کُتے چھوڑ دیتا ہے ۔ان کتوں کا زہر ساری عمر امیر بخش کے اندر گردش کرتا ہے ۔

ناول میں نوآبادیاتی دور کو زیادہ بیان نہیں کیا گیا ،اس دور کا صرف سرسری جائزہ لیا ہے لیکن انگریز دور میں بنی جانے والی عمارتوں کا ذکر موجود ہے ۔

سانسی لوگ بھی اسی دنیا پور گاؤں سے تعلق رکھتے ہیں ۔ان کا رہنا سہنا سب سے الگ ہے ۔دوسرے لوگ تو ان کو ناپاک سمجھتے ہیں ۔ان سے دور رہتے ہیں اور نہ ہی ان سے کوئی لین دین رکھتا ہے ۔یہ لوگ نہ ہی کوئی کام کرتے ہیں اور نہ ہی ان کو کوئی کام دینے پر راضی ہے ۔یہ لوگ مرے ہوئے کتے ،بلی گدھے ،گھوڑے اور نیولے بھون کر کھاتے ہیں ۔ان کے حوالے سے مستنصر حسین تارڑ رقم طراز ہیں :

ہر کوئی جانتا تھا کہ یہ چنگڑ ،لگڑے اور سانسی لوگ ۔۔۔کتے ، بلّے ، کچھوے ،گرگٹ ،نیولے یہاں تک کے گلہریاں بھی بھون کر کھا جاتے ہیں پر اُن کی عید تب ہوتی تھی جس روز مردار گوست اُن کے حلق میں اُترتا ،یہ اُن کی مرغوب ترین غذا تھی ۔۔۔جب کوئی ڈنگر مرنے کو ہوتا تو اُس کے مالک جاٹ سے بہت پہلے سانسیوں کی بستی میں اُس کی مرگ کی مہک پہنچ جاتی ۔۔۔کسانوں کے اندر بھی جانوروں کی ایک ایسی حس تھی کہ مرگ کی بوسونگھ لیتے تھے ۔ یہاں تک کہ اُن کو اپنی

موت کا بھی علم ہو جاتا تھا۔۔۔چنانچہ وہ اپنے اُس بیل یا گائے کو ہانکتے۔۔۔اُس کی پسلیوں میں کچوکے دیتے اُسے گاؤں سے دور کسی ویرانے تک لے جاتے۔۔۔اور جب کبھی اُن کی یہ حس کام نہ کرتی، کُند ہوجاتی اور وہ بیل گائے یا بھینس اُن کے کنویں پر یا ایک کوٹھڑی کے اندر مر جاتا تو اُسے گھسیٹ کر ویرانے تک لے جانا بہت دشوار ہوجاتا۔۔۔تو مرگ کی وہ مہک جو دنیا پور کی سانسی بستی میں سب سے پہلے پہنچتی تھی۔۔۔وہی مہک آسمان پر سستی سے تیرتے گدھوں تک جا پہنچتی تھی اور وہ پَر پھیلائے نیچے اُتر کر سنگریزوں کے میدان کے آسمان کے اوپر ۔۔۔نیچے بھاگتے سانسیوں سے آگے جانے کی جستجو کرتے ہوا سے خالی فضا میں پرواز کرنے لگتے۔۱۵

ناول کا پہلا حصّہ دنیا پور گاؤں سے تعلق رکھتا ہے۔اگر گہرائی کے ساتھ غور وفکر کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے ناول کے پہلے میں دنیا پور،کوٹ مراد، نت کلاں ،کوٹ ستارہ گاؤں کے پس منظر میں مستنصر حسین تارڑ نے بیسویں صدی کے ہندو مسلم معاشرے کی عکاسی بھرپور انداز سے کی ہے یہ رنگ کسی اور ناول میں نظر نہیں آتا۔

اس کے بعد امیر بخش، سانسی اور عزیز جہاں لاہور کا رخ کرتے ہیں تا کہ کوئی اچھا روزگار حاصل کیا جائے۔لاہور آکر صابن بیچنے کا کام کرتے ہیں لیکن اس کام کا ان کو فائدہ نہیں ہوتا اور آخر رام داس کے بھٹہ پر کام کرنے پر معمور ہو جاتے ہیں۔

اس ناول کا اہم کردار انعام اللہ ہے جو مسجد کی سیڑھیوں میں پڑا ملا۔اگر وقت پر سانسی نہ آتا تو لوگ اس کو ایک نعت خواں کے کہنے پر سنگسار کردیتے لیکن سانسی یہ کہہ کر بچا لیتا ہے کہ یہ میرا بچہ ہے یہ حرامی نہیں ہے۔سانسی اس کو گھر لے کر آتا ہے۔اب اس کے تین باپ تھے ایک سانسی،عزیز جہان اور امیر بخش۔

ناول کا ایک پہلو انڈیا پاکستان کی تقسیم کا بھی ہے جس کو بہت سے ادیبوں نے اپنے ناول کا موضوع بنایا ہے۔خس وخاشاک زمانے کے پلاٹ میں تقسیم کا تذکرہ موجود ہے۔اس کا ذکر راکھ میں بھی کیا گیا ہے۔لوگوں کا ایک دوسرے کی جان کا دشمن ہونا،عمارتوں کا جلنا، بربریت، قتل وغارت گری سب کا احوال ناول کے پلاٹ میں شامل ہے۔بنگلہ دیش کے قیام کا پس منظر بھی ناول کا حصّہ ہے اور اس کی نشاندہی مقدس

بانو کے کردار کے ذریعے کی گئی ہے۔اس کا پیٹ پھولا ہوا ہے جس کو پھلانے میں نہ جانے کتنے لوگوں نے اپنا کردار ادا کیا تھا۔

قیام پاکستان کے بعد ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ یہ ایک فلاحی راست بنتی۔اسلام کے اصولوں کے مطابق ملک کا نظم وضبط چلایا جاتا، بنیادی سہولتوں کی فراہمی کو یقینی بنایا جاتا تعلیم کو ٹھوس بنیادوں استوار کیا جاتا، لیکن ایسا نہ ہوسکا کیوں کے یہاں کے عوام میں اتنا شعور تھا ہی نہیں ۔ اس تلخ حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مستنصر حسین تارڑ لکھتے ہیں:

> ہندوستان پر ہندوستانی مسلمانوں نے نہیں درآمد شدہ مسلمانوں نے حکومت کی ---اور جب ان مقامیوں کی جُھولی میں یکدم ایک ملک ڈال دیا گیا تو وہ نا اہل اور نا مراد نکلے---ایک آزاد سلطنت کے کاروبار کو چلانا اُن کی سرشت میں ہی نہ تھا---اُس کا متحرک زمانوں اور تاریخ کے اُلجھاوے میں اُلجھتا ذہن سوال کرتا کہ آخر ہندوؤں کو بھی تو اُن ماضی قریب میں ایک سلطنت چلانے کا کچھ تجربہ نہ تھا تو وہ کیسے اتنے وسیع ملک کو سنبھال گئے ---شائد اس لیے کے اُنہوں نے اپنی سینکڑوں صدیوں کی محرومی اور محکومیت سے سبق سیکھا اور دوبارہ کبھی محکوم نہ ہونے کا ارادہ کرلیا---اور اُنہوں نے ہماری طرح اپنی سرزمین کو سوتیلا نہ سمجھا---سگا جان کو اپنے جسم و جان کا ایک حصّہ بنالیا---جب کہ ہم خاک وسمرقند و بخارا کو اپنی آنکھوں سے لگاتے رہے اپنی خاک کو سرمہ جان کر ان آنکھوں میں نہ لگایا۔۱۶

ناول میں ضیاء الحق کے دور کا بھی تذکرہ موجود ہے۔انعام اللہ بڑا ہوکر ایک صحافی اور ناول نگار بن جاتا ہے۔اور ایک اختلافی کالم لکھنے پر کوڑے مارے جاتے ہیں۔اس کے بعد ان کو ایک ناول لکھنے پر ملک بھر میں اس کے خلاف مظاہرے شروع ہو جاتے ہیں جس پر امیر بخش ان کو ملک چھوڑنے کا مشہورہ دیتے ہیں۔

انعام اللہ ملک چھوڑ کو امریکہ ہجرت کر جاتا ہے۔وہاں پر وہ مختلف کام کرتا ہے۔اور اپنے آپ سے سوالات بھی کرتا ہے کہ یہ کیسا رزق ہے۔جن کندھوں کو بوجھ اٹھانے کی عادت نہ تھی اب اس کے کندھوں پر نیو یارک کے خالی ڈبے---بوتلیں---کارٹن، پیشاب سے بھرے شاپر بیگ، غلیظ چیتھڑے بچوں کے ڈائپر یعنی

نیویارک شہر کی تمام گندگی کا بوجھ اس کے کندھوں پر ہوتا ہے۔

نیو یارک میں انعام اللہ کے رہنے کا بھی کوئی آسرا نہ تھا صرف چند دن ایک جاننے والے شخص منظور کے پاس قیام کیا۔ اس کے بعد ان کے لیے صرف کھلا آسمان تھا، نیو یارک کی سڑکیں تھیں اور سونے کے لیے زمین اور پارک یا پھر کسی فلائی اوور کے تلے رات گذارتا اور بعض دفعہ تو کہیں بھی پناہ نہ ملتی تھی۔ نیویارک میں انعام اللہ جیسے لوگوں کی نمائندگی ان الفاظ میں کی گئی ہے:

> اور اُس عارضی آسائش کے بعد کھلا آسمان تھا۔۔۔اُس کے سر پر کوئی چھت نہ تھی ۔۔۔جونہی رات ہوتی وہ کبھی کسی پُل کے نیچے۔۔بروک لین کے پُل کے تلے۔۔۔شہر کے پسماندہ حصّوں کے فٹ پاتھوں پر جہاں پولیس کا آنا جانا کم ہوتا تھا۔۔۔سنٹرل پارک کے کسی بنچ پر۔۔۔اور کبھی کبھار وہ پوری رات چلتے پھرتے گذار دیتا اور کہیں بھی پناہ نہ ملتی۔۔۔اور پُلوں کے نیچے ،فلائی اوورز کی چھتوں تلے۔۔کسی جنک یارڈ میں وہ تنہا نہ ہوتا اُس جیسے اوربھی بے آسرا لوگ ہوتے ۔۔۔اور اُن میں انعام اللہ نے جانا کہ چند ایسے لوگ بھی ہیں جنہوں نے جان بوجھ کر اپنی آسائش ترک کر کے یُوں بے آسرا اور بے گھر ہوجانا منتخب کیا۔۔۔۱۷

ناول میں سوویت یونین کا بھی ذکر موجود ہے۔اس موضوع پر مستنصر حسین تارڑ نے اپے غزال شب کے نام سے ایک بھر پور اور جامع ناول تحریر کیا ہے جس میں سوویت یونین کے عروج وزوال کی تمام داستان بیان کی ہے۔ خس وخاشاک زمانے میں سوویت یونین کو ایک کردار کے ذریعے بیان کیا گیا ہے۔ جو ہزارہ قبیلے کا ایک افغان تھا، لاہور میں پلا بڑھا تھا۔ ایف سی کالج سے بی اے کیا۔ فارسی سے زیادہ پنجابی میں رواں تھا بہت سے پنجابی فلموں کے نام زبانی یاد تھے۔ان کا نام منظور نظر ہے۔ یہ احمد شاہ مسعود کے ساتھ افغانستان آیا تھا اور روسیوں کے خلاف جہاد میں شامل ہوگیا۔ احمد شاہ مسعود کی اونی ٹوپی آج بھی ان کے پاس ہے۔ جب کبھی وہ پاکستان اور افغانستان کی یاد میں اداس ہوتا ہے اسی اونی ٹوپی کو پہن کر اپنے آپ کو آئینہ میں دیکھ لیتا ہے۔ وہ روسیوں کی پسپائی کے بعد کے دور کو یاد کرتے ہوئے کہتا ہے:

> رُوسیوں کی پسپائی کے بعد ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ ایک آزاد اور جمہوریت پسند نئے افغان کی بنیاد رکھی جاتی لیکن ہوا یہ کہ ایک ایسی خانہ جنگی شروع ہوگئی جس نے پورے افغانستان کو برباد کر کے رکھ دیا۔ پشتون ہمیں شمال والوں کو ملیا میٹ کر دینے پر تُل گئے اور اس کے ساتھ اُن کے مختلف گروہ آپس میں بھڑنے لگے ۔۔۔تمہیں یہ تو علم ہوگا کہ روسیوں کے بعد بھی جب تک نجیب اللہ برسراقتدار رہا کابل ایک ہنستا بستا شہر رہا جس کی ایک اینٹ کو بھی گزند نہ پہنچا تھا ۔۔۔روسیوں کے رخصت ہوتے ہی پشاور کی بین الاقوامی گہما گہمی بھی ختم ہوگئی ۔۔۔اُن زمانوں میں جب امریکہ کے دروازے ہر افغان کے لیے کھلے تھے اور سیاسی پناہ حاصل کرنے میں کچھ دشواری نہ تھی ۔۔۔میں ادھر چلا آیا۔۔۔۱۸

سانحہ ستمبر اکیسویں صدی کا ایک اندوہناک سانحہ تھا جس کی گونج پوری دنیا میں سنی گئی تھی ۔ پاکستان پر اس سانحہ کے اثرات سب سے زیادہ اور منفی طور پر مرتب ہوئے ۔خس و خاشاک زمانے کے پلاٹ میں اس کا ذکر بھی بھی کیا گیا ہے کہ کس طرح جہازوں کی مدد سے ورلڈ ٹریڈ سنٹر کو زمین بوس کر دیا گیا جس میں بے شمار معصوم لوگوں کی ہلاکت بھی ہوئی ۔ساری دنیا کی ٹی وی سکرین پر اس کے مناظر بار بار دکھائے جا رہے تھے۔لوگوں کا عمارتوں سے چھلانگ لگانا کے مناظر انتہائی دل سوز تھے جن کو دیکھنا مشکل تھا۔پہلی بار دیکھنے سے یوں محسوس ہوتا کہ شائد ہالی وڈ کی کسی فلم کے سین کی عکس بندی کی جاری ہے۔ اور جو لوگ زمین پر موجود تھے وہ بھی اپنی جانیں بچانے کے لیے چیخیں مارتے ہوئے آگے کی طرف بھاگے جا رہے تھے اس سانحہ کی عکاسی ناول میں ان الفاظ میں کی گئی ہے:

> ایک انبار،دُھول اور گھنی نابینا گرد کا چوڑی شاہراہوں کو بھرتا اوجھل کرتا اُمڈتا چلا آ رہا تھا اور اُس کے سیلابی ریلے کے آگے آگے خوف کی ڈسی ہوئی مخلوق بھاگتی اپنی جانیں بچانے کی غرض سے فرار ہونے کی کوشش میں بھاگتی چلی آ رہی تھی ۔۔۔جیسے ٹریڈ ٹاور کا آتش فشاں پھٹ پڑا ہو۔۔۔اُس کی آتشی گرم جلا دینے والی راکھ اُن کا پیچھا کر رہی ہو اُن کے تعاقب میں ہو۔۔۔اور وہ اُس راکھ کی زد میں آ کر بھسم نہ

ہو جانا چاہتے ہوں اور اُس سے فرار ہو رہے ہوں ۔۔۔جیسے خوشی محمد تھانیدار کے
کتے اُن کا پیچھا کر رہے ہوں ۔۱۹

ناول کے اس حصّے میں مستنصر حسین تارڑ ایک نئی اور پُر تاثیر تکنیک بین المتونیت استعمال کی ہے ۔اس بات کا جائزہ ضروری ہے کہ مستنصر حسین تارڑ نے ناول کے اس حصّے میں اس تکنیک کو کیوں استعمال کیا ہے۔اس تکنیک کا استعمال اس لیےضروری ہے کہ اس سے سانحہ 9/11 کےمفہوم کی تفہیم آسان ہو جاتی ہے۔سانحہ ستمبر کی تفہیم کے لیےمستنصر حسین تارڑ نے ناول کےمتن میں،ٹیل آف گینجی،فالنگ مین،قلعہ جنگی اور روایتی انداز میں لکھی گئی کتاب تہذیبوں کا تصادم،کوسانحہ 9/11کے پس پردہ حقائق کےمفہوم کی تفہیم کے لیےاستعمال کیا ہے۔

ناول میں عراق پر امریکی حملے کوبھی موضوع بنایا گیا ہے کہ کس طرح امریکہ نے اپنے صرف دو مینار ڈھے جانے پر کس طرح پوری انسانیت کو اپنے میزائلوں اور بموں کی آگ میں بھسم کر دینے پر تُل گیا۔اب عراق میں نہ تو چڑیوں کی آوازیں آتی اور نہ ہی کسی بچے کی رونے کی آواز سنائی دیتی کیونکہ ان سب کو آگ میں جلا کر بھسم کر دیا گیا تھا اور نہ یہ کسی کیمرہ میں دکھائی دیتے تھے کیونکہ کیمرہ میں تو صرف وہ ہی چیز دکھائی دیتی ہے جس کا کوئی وجود ہو،جو چند دیر پہلے دھواں ہو کو فضا میں غائب ہوگئے ہوں ان کو کیمرہ کس طرح دکھا سکتا تھا۔ دنیا کے تمام کیمرے اس ٹیکنالوجی سے عاری تھے۔عراق پر حملے کے مناظر کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

سکرین کی سیاہی میں آسمان سے نازل ہوتی کروز میزائلیں اور ڈیزی کٹر دکھائی نہیں دیتے۔۔۔یوں لگتا ہے کہ وہ تو اُس کے گلی کوچوں اور شاہراہوں کی بنیادوں میں مدتوں سے مدفون تھے اور اب کسی سامری کے انتقام کے سحر سے وہ یکدم پھٹنے لگے ہیں۔۔۔بابل کے مینار جو ابھی تک سر بلند اور قائم تھے،اوندھے ہو کر منہدم ہو رہے ہیں۔۔۔اُس کے معلق باغوں کے شجر جڑ سے اکھڑ رہے تھے اور اُن کے پتے آسمان سے برستی زہریلی آگ کی تاب نہ لا کر راکھ ہو رہے ہیں۔۔۔بے شک یہ باغ ایک بلندی پر معلق تھے۔۔۔لیکن اُن سے بھی کہیں بلندی پر وہ عفریت حرکت میں تھے جو فورٹریس اور بی باون لانسر کہلاتے تھے اور اُن میں سے ایسی

> خاموش آگ برستی تھی جو آتش نمرود سے کہیں بڑھ کر غضب ناک اور دیوتاؤں کو بھی بھسم کر دینے والی تھی ۔۔۔اُن متحرک آسمانی عفریتوں میں جو سوار تھے، اُنہیں کچھ خبر نہ تھی کہ اُن کے نیچے اُن کی میزائلوں اور بموں کی زد میں شہر بابل کے مینار اور معلق باغ ہیں کہ اگر اُن کے دو جڑواں مینار ڈھا دیئے گئے تھے تو اُن کے سامنے یہ مینار کیا حیثیت رکھتے ہیں اور وہ کیا جانے کہ یہ معلق باغ کیا ہیں، وہ تو صرف اپنے سنٹرل پارک کو جانتے ہیں۔۔۔۲۰

ناول کا اختتام نئے آدم کے تصور پر ہوتا ہے۔انعام اللہ کرامریکہ میں انگریزوں کی نفرت کا سامنا کرنا پڑا جس کی وجہ سے انعام اللہ کو کینیڈا ہجرت کرنا پڑی۔ یہاں اس بات کا تذکرہ بھی ضروری ہے مستنصر حسین تارڑ نے ان کرداروں کو باہر غیر ملک میں آباد ہوتے ہوئے بیان کیا گیا ہے۔وہاں ہی پر شادیاں ہورہی ہیں اور وہاں پر ہی کاروبار کر رہے ہیں ۔یہاں سے ہی مستنصر حسین تارڑ نے نئے آدم کے تصور کو تخلیق کیا ہے۔ڈاکٹر ممتاز احمد خان اس نئے آدم کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ناول کا ماجرا چوں کہ برصغیر کے کرداروں کو اس کے اپنے جغرافیہ سے باہر ریاست ہائے متحدہ امریکہ کا باسی بنا کر پیش کرتا ہے لہٰذا ناول نگار کی جانب سے ''نئے آدم'' کی تلاش از بس ضروری ہے۔۲۱

آدم تو اس زمین پر بہت سارے ہیں پھر شباہت کون سے نئے آدم کی بات کرتی ہے۔یہاں پر شائد نئے آدم سے مراد ایسا آدم ہے جس کے گلے میں کسی بھی مذہب کی مالا نہ ہو۔وہ اپنی زندگی کی تقدیر کو خود بہتر بنائے،وہ کسی قسم کے تعصب کا شکار نہ ہو۔اُس کا مذہب انسانیت کی خدمت کرنا ہو۔اُس کا ماحول ایسا ہو جہاں پر انسانی نفرت کی بُو نہ ہو اور نہ ہی کسی قسم کے دھاکوں سے آشنا ہو۔شباہت انعام اللہ سے کہتی ہے:

> ۔۔۔بے شک میرا دادا مر چکا ہے۔۔۔وہی میرا واحد ربط تھا اپنی معدوم ہوتی نسل سے لیکن سروسانسی کی اس نسل کا تسلسل میرے پیٹ میں پرورش پاتا ہے ۔۔۔میرے وجود کے اندر جس کونپل نے جنم لیا ہے۔۔۔جیسے آغاز پر پانیوں پر تاریکی اتری ہوئی تھی اور اس نے کہا تھا کہ روشنی ہو جا۔۔۔اور روشنی ہو گئی

۔۔۔ہم بھی چاہیں تو اس کونپل میں ایک نئی روح پھونک سکتے ہیں ۔۔۔جو پژمردہ اور بارود کی بُو سے آلودہ نہ ہو اور ہم اُسے ایک نیا دل جو گوشت پوست کا دھڑکتا دل ہو عطا کر سکتے ہیں جو کبھی دھماکوں سے آشنا نہ ہو ۔۔۔اس زمین کی جو تاریکیوں میں ڈوب کر ہمیشہ کے لیے معدوم ہو جانے کو ہے ،ہم اسے پھر سے اپنے بچوں سے آباد کر کے اُسی طور روشن کر سکتے ہیں جیسی کہ یہ اس کے فعمان سے روز اول روشن ہوئی تھی کہ اس آبی پردے کے پار بھی تو ہم ہیں جو آخری سچ اور حق ہیں ۔۔۔ہم ہی حق ہیں ۔۔۔اگر اس نے ہمیں تخلیق کیا ایک بُت میں ڈھالا تو اس کمہار کے ہاتھوں کی حدت ہماری مٹی میں بھی تو گندھی ہوئی ہے اور یوں ہم بھی تخلیق پر قادر ہیں ۔۔۔اور وہ نئی دنیا جو ہمارے بچوں سے دوبارہ آباد ہوگی اس کا آسمان بھی نیا ہوگا جس پر وہ سب پنکھ پکھیرو پرواز کریں گے جو کبھی درختوں کے نیچے مردہ پڑے تھے اور ہم ان گودوں کو جنہیں سنسان کر دیا گیا ہے پھر سے بھر دیں گے ۔۔۔اگر تم چاہو۔۲۲

مختصر الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس ناول کے پہلے حصّے میں بیسوی صدی کے سیاسی سماجی پس منظر کو بیان کیا ہے۔ اس کے بعد وقت کا بہاؤ، تاریخ ،ہندو مسلم تعلقات، سیاسی سماجی، معاشرتی اور تہذیبی تبدیلیوں کا بیان، نو آبادیاتی نظام، انڈیا پاکستان کی تقسیم، قتل و غارت گری، پاکستان کے قیام کے بعد کی سیاسی صورت حال انڈیا پاکستان کی جنگیں، آمروں کا دورِ حکومت، افغانستان کا جہاد، روسیوں کی پسپائی، سانحہ ستمبر، افغانستان اور عراق پر امریکی حملے کی مکمل داستان ہے جو ۱۹۳۰ء سے شروع ہو کر سانحہ 9/11 پر آ کر ختم ہوتی ہے۔اس حوالے سے ڈاکٹر ممتاز احمد خان اپنی کتاب اُردو ناول کے چند اہم زاویے :اضافوں کے ساتھ میں لکھتے ہیں:

''خس و خاشاک زمانے'' پڑھنے کے بعد اندازہ ہوا کہ ہمارا ذہین ناول نگار تاریخ اور وقت سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکتا، شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ ہماری تاریخ تقسیمِ ہند سے جڑی ہوئی زندگی کے اکھڑ جانے، مسلم غیر مسلم تعلقات، غیر ملکی فاتحین کا ہندوستان میں آنا ،نو آبادیاتی دور، مغلیہ سلطنت کا خاتمہ، دو قومی نظریے کا پر

چار، ہندو مسلم آویزش کے عوام الناس کے اذہان پر اَن مٹ اثرات ،تہذیبی کایا کلپ، پاکستان کی تخلیق، کم علمی کے باعث ضعیف الاعتقادی، تنگ نظری، توہم پرستی اور جاہلانہ عقائد اور مختلف النوع تعصبات کی مشترکہ داستان لکھی ہوئی ہے۔۲۳

خس و خاشاك زمانے کے کرداروں پر بات کی جائے تو یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کی مستنصر حسین تارڑ کو کردار نگاری پر مہارت تامہ حاصل ہے۔ان کے کردار وقت اور زمانے کے ساتھ ساتھ سفر کرتے ہیں جس کی وجہ سے ان کرداروں پر فطری اثرات نمایاں محسوس ہوتے ہیں۔ان کے تخلیق کردہ زیادہ تر کردار حقیقی زندگی کی نمائندگی کرتے ہیں جن کا ہماری سیاسی، سماجی تاریخ سے گہرا تعلق رہا ہے۔

خس و خاشاك زمانے کا پہلا اہم کردار بخت جہان ہے جو محمد جہان کا چھوٹا بھائی ہے۔ بخت جان کے کردار کو پڑھ کر کیدو کا کردار ذہن میں آتا ہے۔لیکن بخت جان کا کردار کیدو کے مقابلے میں کہیں زیادہ مہارت سے تراشا گیا ہے۔اس کردار میں کیدو سے زیادہ مکر و فریب کی صلاحیتیں ہیں۔ اس کی صلاحیتوں کا مقابلہ شائد شیطان بھی نہ کر پائے۔اپنے بھائی محمد جہان کی وفات کے بعد فوراً اُس کی زمینوں پر قبضہ کر لیتا ہے اور اپنی بھابی کو دھمکی دیتا ہے کہ اگر اُس نے اس حوالے سے آواز اٹھائی تو وہ اس کی بیٹیوں کو مہاراجہ رنجیت سنگھ کو بیچ دے گا۔ بیٹی کی پیدائش کے وقت گھر میں مجرا کراتا ہے۔کیکر کی شراب کا شوقین بھی ہے۔عورت اور گھوڑیوں کا حد درجہ شوقین ہے۔ بخت جہان اپنے دوست لہناں سنگھ کی بیوی سے بھی شادی کر لیتا ہے۔جبکہ وہ اپنی بھتیجیوں کی شادی میں رکاوٹ ڈھالنے کا کوئی موقع ضایع نہیں کرتا۔ بلکہ وہ اپنے بوڑھاپے میں بھی یہ کہتا ہے کہ عمر کا زوال ہے ورنہ میں کڑی یا ہوا کسی کے قابو نہیں آ سکتا جبکہ اب حالت یہ ہے کہ اپنی بھتیجی کی مری ہوئی مرغیوں کو کوڑے کے ڈھیر سے اٹھا کر کھا جاتا ہے۔مردار کھانے والے سانسی بھی اس پر ترس کھاتے ہیں جب ان کی بھتیجی اس کی زیادتیاں یاد کرواتی ہے تو اس پر بخت جہاں کہتا ہے:

ہاں نور بیگے ایسا ہی ہوا تھا۔۔۔ بخت جہان کے چہرے پر کوئی پشیمانی نہ تھی۔۔۔ پر وہ اپنی ٹیڑھی گردن جھکائے یوں کھڑا تھا جیسے اپنے گناہوں کے بوجھ سے ڈھے جائے گا اور صرف اس لیے کہ وہ فی الحال نور بیگم کے ساتھ بگاڑ نہیں سکتا تھا ۔۔۔اُسے وہ مُرغ در کار تھا۔۔۔اُس کے تالو میں اُس کے دیسی گھی میں بھنے

> ہوئے ماس کا سواد پھوٹتا تھا اور اُس نے طے کر لیا تھا کہ اس مُرغ کی موت کے بعد جب وہ صحن سونا ہو جائے گا تو وہ کسی روز سینہ تان کر اس چوکھٹ کے سامنے کھڑے ہو کر کہے گا۔۔۔آہونور بیگے میں نے تیری بہن اپنی سگی بھتیجی زینب بیگم کی ڈولی اس ویہڑے سے اٹھنے نہیں دی تھی اور تمہاری ماں بہشت بی بی چوری چھپے اُسے تحصیل داروں کے گھر لے گئی اور وہاں سے اُسے رخصت کیا تھا اور مجھے تب خبر ہوئی جب کہار ڈولی لے گئے اور میں اپنی ایک اَتھری گھوڑی پر سوار ہو کر اُس ڈولی کو روکنے کے لیے اُس کے پیچھے گیا تھا پر وہ چناب پار کر گئی۔۔۔تو نے میرا جو کرنا ہے کر لے۔۔۔پر ابھی اُسے سرنگوں رہنا تھا اُس مُرغ کے لیے جو کُڑی یا ہوا مرنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔۔۔۲۴

ناول میں کچھ مخصوص داتوں کو بھی تنقید کا نشانہ بنایا گیا ہے جو ہمارے معاشرے کی ایک تلخ حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے۔جب بخت جہان (جو ایک جاٹ برادری سے تعلق رکھتا ہے) ایک آوارہ مزاج کی عورت سے شادی کر لیتا ہے تو مستنصر حسین تارڑ اس پہلو پر تنقید ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> لوگوں کے ذہن میں سوال اٹھتے تھے اگر چہ وہ ان کا اظہار بخت جہان کے قہر کی وجہ سے نہیں کرتے تھے کہ اُس نے ایک آوارہ مزاج عورت سے شادی کیوں کی جس سے گاؤں کا ہر دوسرا نوجوان حظ اٹھا چکا تھا۔۔۔اُس کا جواب یہی ہے کہ آخر اچھے بھلے شرفاء چوہدری،قریشی اور گیلانی اور سیّد باشاہ بازاری،طوائفوں اور رنڈیوں سے کیوں شادی کر لیتے ہیں۔۔۔ایسی عورتوں میں لذت کی کوئی ایسی رَمز ہوتی ہے۔۔۔کوئی کارکردگی ایسی ہوتی ہے کہ مرد اُسے اپنے گھر میں ڈال لیتا ہے۔۔۔۲۵

لیکن بخت جہان میں ایک محبّ وطن کی صفت موجود ہے یہ ان کی واحد صفت ہے۔ان کی گردن ہمیشہ غرور سے ٹیڑی رہی،مرنے کے بعد ان کی قبر میں بھی ٹیڑھا پن موجود تھا جو اس کی کجر روی کی علامت ہے۔

ناول کا دوسرا اہم کردار امیر بخش ہے۔جو محکم دین کا بیٹا ہے۔اس کی ماں ان کو پڑھا لکھا انسان بنانا چاہتی ہے کیونکہ اس کے سارے ماموں بھی پڑھے لکھے ہیں۔نا مساعی حالات میں میٹرک کرنے کے بعد اس

کی ماں ان کو اپنی ایک برادری کے شخص خوشی محمد کے پاس اس امید سے بھیجتی ہے کہ وہ اپنی برادری کا ہے اور ضرور آپ کی نوکری کا بندوبست کرے گا۔لیکن یہ تھانیدار اس کے پیچھے کُتے چھوڑ دیتا ہے جن کا زہر ساری عمران کی پنڈلیوں میں گردش کرتا ہے۔اب ان کے لیے برادری صرف ایک ڈھکوسلے سے کم نہ تھی۔لاہور آکر پہلے صابن بیچنے کا کام کرتا ہے اور بعد میں رام داس کے بھٹے پر اینٹیں بنانے کا کام شروع کر دیتا ہے۔یہاں پر اس کردار کے ساتھ عزیز جہان اور سانسی بھی موجود ہیں۔امیر بخش ہر قسم کے تعصب سے پاک انسان ہے۔یہ ناول کا انتہائی مثبت کردار ہے جو سانسی جیسے شخص کو بھی اپنے ساتھ کھانے میں شامل کرتا ہے۔

سانسی کا کردار انتہائی دلچسپ اور فکر انگیز ہے۔نہ اس کا کوئی مذہب ہے اور نہ ہی کوئی برادری۔مردار کھانے میں لطف محسوس کرتا ہے۔اس کی عید اُس دن ہوتی ہے جس دن ان کے ہاتھ کوئی نیولہ آجائے۔ان کو اپنی معدوم ہوتی ہوئی نسل پر بھی افسوس ہے۔مردار کھانے میں ان کا مقابلہ آسمانوں پر موجود گدھوں سے ہوتا تھا۔اس حوالے مستنصر حسین تارڑ لکھتے ہیں:

> اُن دونوں میں سے گِدھوں اور سانسیوں میں سے جس نے بھی سب سے پہلے اُس اکڑ چکے ڈنگر تک پہنچ جانا تھا جو کب کا مردہ ہو کر نہایت تے آور بُو دے رہا تھا اور یہ بُو عام انسانوں کے لیے تھی جبکہ اُن سانسیوں کے لیے مُردار کی یہ بُو اُن کی حیات کو خوشبودار کر دینے کا ایک سندیسہ تھی۔۔۔تو جس کسی نے بھی گِدھ یا سانسی نے اُس اکڑے ہوئے ڈنگر تک پہلے پہنچ جانا تھا تو اُس نے اُس مردار کا لذیذ ترین گوشت حاصل کر لینا تھا جو اُن کے لیے حیاتِ جاوداں کے حصول سے کم نہ تھا سانسی لوگ اکثر اس مقابلے میں پیچھے رہ جاتے۔۔۔ہار جاتے۔۔۔اُنہیں اپنی بستی میں سے نکل کر سنگریزوں بھرے ویرانے تک پہنچتے ہوئے کچھ وقت لگتا جب کہ گِدھ سُستی سے آسمان میں پرواز کرتے۔۔۔ساکت لگتے۔۔۔جونہی وہ مرگ مہک سونگھتے اپنی گردنیں لامبی کر کے مُردار کی بُو سونگھتے تیزی سے اُڑان کرنے لگتے اور سانسیوں کو مات دے کر مُردار پر گرنے لگتے وہ دونوں گِدھ اور انسان پسند الگ الگ رکھتے تھے۔۲۶

انگریزوں نے ان سانسیوں کو اپنے گیز یٹرز میں مجرمانہ قبیلہ قرار دے رکھا تھا۔انگریزوں نے ہر قوم کے قبیلے اور برادریوں کے درجہ بندی کر رکھی تھی۔انگریز جاٹ اور دیگر برادریوں کا کچھ تو خیال کرتے تھے لیکن ان سانسیوں اور ان جیسی دوسری ذاتوں کا کچھ خیال نہ کرتے اور ہر غلط کام میں ان کو ملوث قرار دیتے۔مستنصر حسین تارڑ رقم طراز ہیں:

> یہ عجب سانحہ تھا کہ وہ جاٹوں اور دیگر ذاتوں کی نسبت قانون کی خلاف ورزی زیادہ نہ کرتے تھے پر انگریز سرکار نے اپنے گیزیٹرز میں ذاتوں اور قبیلوں کی درجہ بندی کرتے ہوئے اُنہیں ''مُجر مانہ سرگرمیوں میں ملوث قبیلہ'' قرار دے رکھا تھا ۔۔۔اور یہ کیسی نہ انصافی تھی ۔۔۔دور پار کہیں بھی کوئی چھوٹا موٹا جرم ہوتا تو سب سے پہلے سانسی دھر لیے جاتے۔۔۔وہ ہمہ وقت ذہنی طور پر مار پیٹ اور پُچھ پڑتیت کے لیے تیار رہتے۔۔۔جونہی آس پاس کے گاؤں میں کسی ڈاکے یا چوری کی خبر پہنچتی تو سارے کام کاج ترک کر کے خوب پیٹ بھر کر کھوے اور نیولے کھاتے اور پولیس کا انتظار کرنے لگتے۔۔۔اُدھر جاٹوں کے لیے دوسروں کی گھوڑیاں کھول لانا ۔۔۔ڈنگر چرا لانا ۔۔۔جی داری اور مردانگی کی اعلیٰ ترین علامتیں تھیں اور ایک جاٹ کی پگڑی کا شملہ اتنا ہی بلند اور پُر تفاخر ہو جاتا جتنے اُس نے یا اُس کے حواریوں دوسروں کے مویشی کھولے ہوں ،گھوڑے چرائے ہوں پر اُنہیں کوئی نہ پوچھتا۔۔۔سارا نزلہ سانسیوں پر گرتا۔۲۷

ناول کا ایک سکھ کردار لہناں سنگھ بھی ۔ یہ کردار بھی اپنی نوعیت کا الگ کردار ہے۔لہناں سنگھ بخت جہاں کا دوست ہے۔لہناں سنگھ ایک انتہائی پُر امن کردار ہے ۔کسی سے آج تک اس کا جھگڑا نہیں ہوا،وہ اپنے کام سے کام رکھنے والا ہے۔کھیتوں میں بھی وہ اپنے جوان بیٹوں سے زیادہ کام کرتا ہے ۔بخت جہاں کا گہرا دوست ہے۔مستنصر حسین تارڑ بیان کرتے ہیں:

> تو لہناں سنگھ کچھ بڑا زمیندار نہ تھا۔۔۔وہی ایک پُر تکبر رکھ رکھاؤ والا مہمان نواز اکھڑ جاٹ تھا۔۔۔دنیا پور کے بخت جہان کے ساتھ اُس کا یارانہ ایک مدت سے چلا

آتا تھا۔۔۔اُن دونوں کی خصلتیں ایک دوسرے سے خاصی مختلف تھیں۔۔۔بخت جہان ایک منتقم مزاج،ایک چڑیا کی اُڑان کو بھی نہ بخشنے والا،محنت مشقت کے قریب نہ پھٹنے والا ،ہاتھ پر ہاتھ دھرے ایک تنکا بھی نہ توڑنے والا ۔۔۔بھائی محمد جہان کی کمائی پر عیش کرنے والا اوراُسے دھمکیاں بھی دینے والا ایک جابر شخص تھا۔۔۔جب کہ لہناں سنگھ کا مزاج اُسکے بالکل اُلٹ تھا۔۔۔وہ اپنے دونوں بیٹوں گو بند سنگھ اور نہال سنگھ کے ساتھ اپنی زمینوں جانوروں سے بھی بڑھ کر دن رات مشقت کرتا۔۔۔رشتے داروں کے ساتھ شفقت سے پیش آتا،ہاتھ اٹھانے میں کبھی پہل نہ کرتا۔۔۔وہ ایک نرم دل اور جذباتی شخص تھا۔۔۔اور بخت جہان کی سخت گیر طبیعت پر اُسے لعن طعن کرتا رہتا۔۔۔البتہ ان دونوں کے یارانہ میں جاٹ ہونے کا فخر قدر مشترک تھا۔۲۸

لہناں سنگھ یہ جانتے ہوئے بھی کہ بخت جہاں عورتوں کا بیری ہے اس کے باوجود وہ اپنی بیوی امرت کور کو اپنے دوست بخت جہان سے پردہ کرنے سے منع نہیں کرتا ہے۔ یہ اتنا پُر امن کردار ہے کہ جب اس کا دوست بخت جہان ان کی بیوی سے شادی کر لیتا ہے تو اس پر بھی اس کو کوئی رنج نہیں ہے بلکہ اس حوالے سے ان کا اپنا فلسفہ بڑا دلچسپ ہے۔شادی کے بعد جب اس کا دوست بخت جہان ،لہناں سنگھ سے ملنے آتا ہے تو بجائے طیش میں آنے کے انتہائی پُر امن انداز میں کہتا ہے:

جب شراب کا مٹکا آدھے سے کم رہ گیا۔۔۔چار پانچ پیالوں کے خاموش گھونٹوں کے بعد لہناں سنگھ نے اپنی داڑھی میں ہاتھ سے کنگا کیا اور یوں بولا جیسے خمار میں نہیں ایک خواب میں بولتا ہو،جہانیاں رَن،تلواراور گھوڑا کسی کے سگے نہیں ہوتے ۔کسی سے وفا نہیں کرتے ۔۔۔ان کا کچھ اعتبار نہیں ہوتا،اُس گھوڑے پر کیا سواری کرنی جسے تمہارا وجود بوجھ محسوس ہونے لگے ۔۔۔اُس تلوار کو نیام میں کیا رکھنا جو تمہارے ہاتھ میں تو ہے اور خود بخود وار نہ کرے۔۔۔اور گھوڑے کی طرح ہی وہ رَن بھی کس کام کی جسے تمہارا وجود بوجھ لگنے لگے ۔۔۔ان تینوں کو اگر وہ تمہارے

> پاس نہیں رہنا چاہیں تو کھلا چھوڑ دو۔۔۔اُنہیں آزاد کر دو۔۔۔جہاں اُن کا جی چاہے جانے دو۔۔۔اُنہیں اپنی انا کی دیوار سے روکنے کی کوشش مت کرو، جانے دو۔۔۔جہانیاں گھوڑے بھی بہت، تلواریں بھی بہت اور رَنوں کی بھی کوئی تھوڑ نہیں ۔۔۔البتہ یاروں کی بہت تھوڑ، بہت کمی ہوتی ہے ۔۔۔تو چنتا نہ کر ۔۔۔اپنے احساس جرم کو بھول جا اور گاموکمہار کے کچے پتلے پتنگ۔۔۔شیشہ پیالے میں سے شراب کا ایک اور گھونٹ بھر۔۔۔رَن، تلوار اور گھوڑا آج تک کسی کے نہیں ہوئے۔۔۔تیرے بھی نہیں ہوں گے۔۲۹

بخت جہان جب اپنے بھائی کے گھر والوں پر ظلم کرتا ہے تو تب بھی لہناں سنگھ اس کو برا بھلا کہتا ہے کہ جہانیاں تو بہت ظلم کمانے والا ہے تو تکبر والا ہے واہیگر وبھی تم پر رحم نہیں کرے گا۔اس پر بخت جہان کہتا ہے میں کیا کرو مجھے ایسا ہی بنایا گیا ہے،اس میں میرا کیا دوش ہے۔

خس و خاشاک زمانے کا ایک اہم کردار انعام اللہ بھی ہے۔انعام اللہ گورو مانگٹ کی مسجد کی سیڑھیوں میں لاوارث پڑا ہوا تھا۔اس کا جب پتا چلا جب فجر کی نماز کے بعد نمازی نماز پڑھ کر جانے لگے۔نمازی اس کو ایک نعت خواں کے کہنے پر سنگسار کرنے لگتے ہیں لیکن عین موقعے پر سانسی آکر اس کو یہ کہہ کر بچالیتا ہے کہ صاحب یہ حرامی نہیں ہے میرا بچہ ہے۔سانسی اس کو اپنے گھر لے کر آتا ہے۔سانسی،عزیز جہاں اور امیر بخش اس کو خوب پیار کرتے ہیں۔امیر بخش تو اسے اپنے بیٹے سے بھی زیادہ پیار کرتا ہے۔

جوان ہونے پر ان کو معلوم ہوا کی میں ایک حرامی ہوں، یہاں پر میرا اپنا کوئی نہیں ہے۔جب وہ اس سوال کو سانسی کے سامنے رکھتا ہے تو اس کے جواب میں سانسی کہتا ہے:

> انعام اللہ۔۔۔کیا ہم میں سے کوئی پورے وثوق سے کہہ سکتا ہے وہ کون ہے اور کہاں سے آیا ہے۔۔۔کیا اس سے کچھ فرق پڑتا ہے کہ ایک انسان کے نام کے ساتھ اُس کی ولدیت کے خانے میں کسی کا نام لکھا ہوا ہے یا نہیں ۔۔۔اُس کے اٹھنے بیٹھنے،سونے جاگنے،محبت کرنے یا کسی کو دھتکارنے یا روٹی کے ذائقے میں کچھ فرق پڑتا ہے ۔۔۔بلکہ یہ شناخت تو اُسے محدود کرکے اپاہج کر دیتی ہے

---کیونکہ وہ اپنے ماں باپ کے عقیدے،قومیت اور تعصب کو اختیار کر کے اپنی شخصیت کو گم کر بیٹھتا ہے ---جو اُسے ہونا چاہیے وہ نہیں ہوتا اپنے خاندانی پس منظر کے محدود چوکھٹے میں جڑا جاتا ہے ---تم تو بہت بھاگ والے ہو انعام اللہ جو شناخت کی قید تمہارا گلا گھونٹ کر تمہیں لکیر کا فقیر نہیں بنا رہی ---ذرا اپنے آس پاس اس معاشرے کو تو پرکھو جہاں جتنے بھی ہیں شناخت والے ہیں ---اور کیسے ذات پات اور عقیدوں کی منافرت میں اُلجھے ہوئے نابینا ہو چکے ہیں جب کہ تم دیکھ سکتے ہو---کیا ان کے درمیان تم اُن سے ماورا جیسا کہ ایک انسان کو ہونا چاہیے ویسے ایک بلند سنگھاسن پر براجمان ان اندھوں کے بھٹکنے کا تماشا نہیں دیکھ رہے۔۳۰

انعام اللہ بڑا ہو کر ایک صحافی اور ناول نگار بن جاتا ہے۔ان کے نظریات پر امیر بخش کے گہرے اثرات ہیں اور اسی وجہ سے وہ آسانی سے دبنے والا نہ تھا۔ضیاء الحق کے دور میں ایک اختلافی کالم لکھنے پر کوڑے مارے جاتے ہیں ۔اور بعد میں ایک ناول آٹو بائیوگرافی آف اے باسٹرڈ لکھا تو ناول کو بغیر پڑھے ہی لوگ سڑکوں پر آ گئے جس کی وجہ سے انعام اللہ امریکہ ہجرت کر جاتا ہے ۔جہاں پر وہ ذلت آمیز نوکری کر کے اپنا رزق کماتا ہے۔سانحہ 9/11 کے انعام اللہ کو امریکی لوگوں کی نفرت کا سامنا کرنا پڑتا ہے ۔آخر کار انعام اللہ امریکہ سے بھی ہجرت کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے اور کینیڈا ہجرت کر جاتا ہے۔یہ انعام اللہ کی تیسری ہجرت تھی ۔کینیڈا ہجرت کے دوران انعام اللہ امریکی برجیوں سے اپنے آپ کو ٹکرا کر خودکشی کرنا چاہتا ہے لیکن سانسی کی پوتی شباہت ان کو اس ارادے سے روک دیتی ہے اور ایک نئے آدم کی تخلیق کا مشہورہ دیتی ہیں۔یہ بھی کیسا اتفاق ہے کی پہلے انعام اللہ کو سانسی سنگسار ہونے سے بچاتا ہے اور کینیڈا میں سانسی کی پوتی ان کو خودکشی کرنے سے روکتی ہے۔

نسوانی کرداروں میں سب سے پہلا کردار نور بیگم کا ہے جس کو اپنے مرغے اور مُرغیوں سے بے پناہ محبت ہے۔ان کے مرغوں میں سے اگر کوئی مر جاتا تو وہ اسے اپنی گود میں لیے سارا دن روتی۔ایک ایک کر کے اُس کے سارے مرغے مر چکے ہیں صرف ایک مرغ باقی بچا ہے اور وہ بھی قریب المرگ ہے ۔نور بیگم کے اس نرالے شوق کے بارے میں مستنصر حسین تارڑ بیان کرتے ہیں:

آس پاس کے گاؤں سے ،دور دراز سے سوہنی سوہنی بانکی چھبیلی مرغیاں منگواتی ۔اُن کے انڈوں کو بھوسا بھرے گولک میں اپنے ہاتھوں سے سجاتی اور کسی کڑ کڑ کرتی مُرغی کو اُن پر بٹھا کر چوزوں کا نکلنے کا انتظار کرنے لگتی۔۔۔راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر اُن پر بیٹھی مُرغی کے پروں تلے جھانکتی کہ کیا کوئی ایک ایسا انڈا ہے جو تُرخ چکا ہے اور اُس میں سے کسی چوزے کی چونچ جھانکتی ہے۔۔۔اور جب پہلا چوزہ انڈے کے چھلکے میں سے برآمد ہوتا تو وہ اُسے اپنے پہلے جائے روشن کی مانند پیارا لگتا ۔۔۔ویہڑے کے اوپر رسیوں کا ایک جال تنا تھا تاکہ ہمیشہ کی منتظر چیلیں جھپٹ کر کسی چوزے کو دبوچ نہ لے جائیں، وہ اپنی مُرغیوں کے عشق میں ایسی مبتلا تھی کہ ہر مُرغی کو انفرادی طور پر اُس سے مخاطب ہو کر اُس سے گفتگو کرتی تھی۔۔۔اُس کا حال چال پوچھتی اور اُس سے لاڈ پیار کی باتیں کرتی تھی یہاں تک کہ پچھلی کوٹھڑی میں لیٹے ہوئے اگر اُسے کسی مُرغی کی کُڑکُڑ سنائی دیتی تو وہ اُس کی شناخت کر لیتی کہ یہ تو فلاں چتکبری ہے اور اُسے شائد پیاس لگی ہے۔۳۱

نور بیگم اپنی ہر مُرغی کی وفات پر ماتم کرتی تھی اور اتنے آنسو بہاتی کی سردیوں میں ان کی رضائی آنسو سے تر ہو جاتی۔ دنیا پور والے ان کو تمسخر میں مُرغیوں کی ماں کہتے لیکن ایک ایک کر کے اُس کی ساری مُرغیاں اور مُرغے رخصت ہو گئے۔

نسوانی کرداروں میں ایک قابلِ رحم کردار صاحباں کا بھی ہے۔یہ ایک مسخ شدہ اور ٹیڑھے بدن کے ساتھ پیدا ہوئی تھی۔وہ ہر وقت ایک نیم تاریک کوٹھڑی میں پڑی رہتی ہے،اس کے ہاتھ بھی مڑے ہوئے ہیں اور ٹانگیں بھی سکڑیں ہوئی ہیں۔لیکن ان کا چہرہ انتہائی خوبصورت ہے،اگر اس کا بدن بھی ٹھیک ہوتا تو وہ ضرور اپنے عہد کی کوئی ہیلن ،سیتایا پھر ہیر ہوتی۔کیونکہ ان کا بدن ٹھڑھا ہے اور چہرہ خوبصورت اس وجہ سے وہ ایک عفریت دکھائی دیتی تھی۔اس قسم کے بچوں کے بارے میں عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ ایسے بچے زیادہ تر تیس سال کی عمر میں وفات پا جاتے ہیں کیونکہ ایسے بچوں کے جسم میں ہر وقت ٹوڑ پھوڑ کا عمل جاری رہتا ہے۔اس لیے جب ان کے ویہڑے میں کوئی مور آ کر بولتا تو وہ یہ سوچتی کہ شائد ان کا وقت اب قریب ہے جو موت کی

منادی کی خبر دے رہا ہے۔

جس دن ان کے بدن میں تھوڑی سی طاقت آ جاتی اُس دن وہ اپنی کوٹھڑی سے باہر آ کر ایک دوسری نیم تاریک کوٹھڑی میں جا کر کبھی سہگل، ماسٹر مدن اور کبھی کملا جھڑیا کی آواز میں گائے گئے گیت سنتی۔ یہ بچی بلا کی ذہین ہے صرف ایک دفعہ سبق پڑھانے وہ سارا سبق یاد کر لیتی تھی۔ جب وہ چھ برس کی تھی تو ایسے ایسے سوالات کرتی جن کا جواب شائد پورے گاؤں میں کسی کے پاس نہ تھا۔ ان کی یاد داشت پر حافظ جی حیران ہوتے۔ لیکن جب کبھی رات کے وقت تکلیف برداشت کرنا مشکل ہو جاتی تو خدا سے شکوہ اس انداز سے کرتی ہیں:

> اُن حافظ جی کو پختہ یقین تھا اگر چہ وہ اس کا اظہار نہیں کرتے تھے کہ ساحباں پر کسی آسیب کا سایہ ہے۔۔۔اُس پر کوئی جن قابض ہے۔۔۔اُس کے ٹیڑے میڑھے بدن کے اندر شکست و ریخت کا ایک مسلسل عمل جاری تھا اور وہ اس بدنی عذاب میں مبتلا راتوں کو سو نہ سکتی تھی۔۔۔جب اذیت سہی نہ جاتی تو چارپائی کے پائے پر اپنا سر پٹختی اور اُس کے دماغ کے اندر جو شادابی تھی وہ مسلسل سوال کرتی کہ آخر کیوں۔۔۔میں ہی کیوں؟۔۳۲

خدا کا شکر ادا کرنے کی بجائے وہ خورشید، مکیش اور حمیدہ بانو کا گایا ہوا گیت ''بدریا برس گئی اُس پار'' کا شکر ادا کرتی جن کو سن کر اُسے کسی حد تک سُکھ مل جاتا۔

ایک اور نسوانی کردار مائلو کا ہے جو محمد جہان کی بیٹی ہے۔ یہ محمد جہان کے گھر کی ہیر تھی۔ یہ ناول کا رومانوی کردار ہے۔ ان کو امام بخش سے عشق ہو جاتا ہے جب ایک روز ایک میراثن ان کی ماں کے پاس امام بخش کا رشتہ لے کر آتی ہے تو وہ اپنی ماں سے کہتی ہے کہ ماں تو ہاں کر دے کیوں کہ میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میرا نکاح عرش پر امام بخش سے ہو گیا ہے اس لیے تو ہاں کر دے۔ لیکن اس جھوٹ کا کبھی پتا نہ چل سکا۔ اس کے حسن کے بارے میں مستنصر حسین تارڑ بیان کرتے ہیں:

> یہی سوہنی جو ہمیشہ مائلو کہلاتی تھی محمد جہان کے گھر پیدا ہوئی۔۔۔جوں جوں وہ جوان ہوتی گئی اُس کے حسن کی روشنائی سے دنیا پور کے کچے بام و در روشن ہونے لگے۔۔۔وہ چاندی راتوں میں اپنی سکھیوں کے ہمراہ جب لکن میٹی کھیلتی تو ہمیشہ

پکڑی جاتی کہ وہ جہاں کہیں بھی جا کر چُھپتی ،کسی اندھیاری کوٹھڑی میں ،روئی کے
ڈھیڑ کے اندر یا کسی شجر کی گھنی شاخوں میں،اُس کے حسن کے چکا چوند چراغ اُسے
ظاہر کر دیتے۔۳۳

دنیا پور کا ایک شاعر اُس کے حسن کا اسیر ہو جاتا ہے اور مائلو کے حسن کو ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:

تیرے رنگ ورُوپ کے انگارے۔۔۔
حجرے میں چلّہ کاٹتے درویش کو بھی جلا کر راکھ کر دیتے ہیں۔۔۔
جو ایمان والے ہوتے ہیں وہ تجھے دیکھ کر بے ایمان ہو جاتے ہیں۔۔۔
اور جو بے ایمان ہوتے ہیں وہ ایمان لے آتے ہیں۔
تیرے بدن میں کوہ طور کا نور ہے۔۔۔
اور اس میں سے عاشقوں کے لیے صحیفے نازل ہوتے ہیں۔۔۔
مائلو تو دُودھ بلوتے ہوئے چاٹی میں نہ جھانکا کر۔۔۔
تیرے سانس سے سفید مکّن سنہری ہو جاتا ہے۔۔۔
تو گلی میں نہ نکلا کر۔۔۔
کچی دیواریں تجھے چھونے کی آرزو میں ڈھیڑ ہو جاتی ہیں۔۔۔
گندم کے ہرے کھیتوں میں نہ چلا کر۔۔۔
تیرے بدن کی حدت سے گندم کے کچے دانے پک جائیں گے۔۔۔
اور یہ جان لے کہ نصیب صرف شکل والوں کے نہیں ہوتے۔
بدشکل دریا پار کر جاتے ہیں۔۔۔
اور شکل والے بیچ منجدھار ڈوب جاتے ہیں۔۳۴

لیکن ایسے کردار زیادہ عمر نہیں پاتے ہیں کیونکہ جہاں ایسی ہیر پیدا ہوتی ہے وہاں ایک کیدو بھی ضرور پیدا ہو جاتا

ہے۔اگر مائلومحمد جہان کی گھر کی ہیر تھی تو محمد جان کا بھائی بخت جہان کے علاوہ کیدو کون ہوسکتا تھا۔شادی کے چند ماہ بعد ہی اس کی سوکن نے اس کو دُودھ میں زہر ملا کر دے دیا۔

خس و خاشاک زمانے کا ایک دبنگ نسوانی کردار امرت کور کا ہے۔امرت کور سِکھ برادری سے تعلق رکھتی ہے اور بنیکا چیمہ گاؤں کے سردار امریت سنگھ کی بیٹی ہے۔امریت سنگھ نے اس کے چال ڈھال کو بچپن میں ہی بھانپ لیا تھا کہ یہ ایک بے قابو روح ہے اسے جلد از جلد کسی شکنجے میں کَس دینا چاہیے ہے۔اور آخر کار ان کونت کلاں گاؤں کے توانا جسم کے چوہدری لہناں سنگھ کے شکنجے میں کس دیا گیا۔

لیکن شادی کے چند سال بعد یہ شکنجہ کمزور پڑ گیا اور اپنی باقی جسمانی وجنسی توانائی کو محفوظ رکھنے کے لیے رات کو ایک الگ کمرے میں سونے لگا۔دوسری عورتوں کی طرح امرت کور بھی صبح کے وقت کھیتوں میں بیٹھنے جاتی اور ساتھ اپنے دو جوان بیٹوں کو بھی لے جاتی جو ہر وقت اپنی ماں سے جڑے رہتے۔پھر ایک دفعہ جب وہ کھیت سے فراغت حاصل کر کے باہر آئی تو اپنے بیٹوں سے کہا کہ میں اب شائد تمہارے باپ کے گھر نہ جا سکو،میں اب بخت جہان کے گھر جا رہی ہوں اور اگر اُس نے مجھے قبول نہ کیا تو میں گاؤں کے جوہڑ میں کود کر اپنی جان دے دوں گی۔

اس پر ان کے دونوں بیٹے پہلے تو کچھ ملامت اور مزاحمت کرتے ہیں،دھمکیاں دیتے ہیں،لیکن امرت کور کہاں کی ڈرنے والی تھی۔جب ان کا ایک بیٹا یہ کہتا ہے کہ جہانیاں تو مُسلا ہے،اس پر ان کا فلسفیانہ جواب بھی بہت عمدہ ہے،وہ کہتی ہے:''وہ اتنا ہی مُسلا ہے جتنا تمہارا باپ سکھ ہے،ان جاٹوں کا کوئی مذہب نہیں ہوتا''۳۵

امرت کور اپنا نام کنیز فاطمہ رکھ کر بخت جہان کے گھر والی بن کر رہنا شروع کرتی ہے اور کنیز فاطمہ اس کے آخری گھر والی ثابت ہوئی۔

ناول کا آخری نسوانی کردار شباہت کا ہے جو سانسی کی پوتی ہے۔زمانے کی تبدیلی بھی کیا چیز ہے کی ایک سانسی جو مرے ہوئے کُتے،بلی،گھوڑے،گدھے اور نیولے کھانے والا ہو اُس کی پوتی امریکہ میں بنک آفیسر ہو۔شباہت کی مصروفیات سانسیوں سے الگ تھی۔وہ صبح سویرے اٹھتی،واش بیسن پر منہ دھوتی،برش کرتی اور روز نئے کپڑے بدل کر بینک جاتی جہاں پر اُن کا سارا دن فام بھرتے،اکاؤنٹس میں سر کھپاتے اور گاہگوں کا مسکرا کر خیر مقدم کرنے میں گزر جاتا۔شام کو اپنی کولیگز کے ساتھ مے خواری کے لیے جانا۔

شباہت کو ہاتھیوں کا بڑا شوق ہے اُس نے اپنے جسم کے کئی حصّوں پر بھی ہاتھی کے ٹیٹو موجود بنوا رکھے ہیں۔ان کو ہاتھی سے عشق ہے۔یہ ہاتھی اتنے زور آور ہیں کی امریکہ جیسے ماڈرن ملک میں بھی وہ بے راہ روی کا شکار نہیں ہوتی۔وہ ہر روز انعام اللہ کی شاپ پر ہاتھی خریدنے آتی ہے اور انعام اللہ کے عشق میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ مستنصر حسین تارڑ لکھتے ہیں:

> اور اب شباہت پر ایک ناگہانی آفت آن پڑی تھی ---یہ لاپروا،اُس کے وجود سے غافل ایک گرزلی بیئر اُسے ایسا دکھائی دیتا تھا کہ اُس کے اندر خطرے کے جتنے بھی الارم تھے اُنہوں نے گرر گرر ،ٹن ٹاٹن آسمان سر پر اٹھا لیا ---اتنا شور ہوا ---اور اس شور میں کچھ گھنٹیاں بجتی تھیں گئے زمانوں کے کسی ایسے مندر میں جہاں کرشن کے سامنے ایک میرا براجمان بھجن گاتی یہی گھنٹیاں بجاتی تھی ---اُس کے بس میں نہ رہا کہ وہ اُس پر ایک اور نظر نہ ڈالے---فرار ہو جائے---کہ اُس دوسری نظر نے اُسے محبت کے سراب کے شکنجے میں کس لینا تھا۔۳۶

دونوں ناولوں کے مطالعہ سے یہ بات بھی عیاں ہے کہ مستنصر حسین تارڑ کے ناولوں کے کردار کثیر الثقافتی معاشرے کی نمائندگی کرتے ہیں۔اس بات کا جواز اپنے ایک انٹرویو میں بیان کرتے ہیں:

> سب سے پہلا جواز تو گلوبل ویلیج کا ہی بنتا ہے اُس کے بعد جواز یہ ہے کہ میں گھوما پھرا بہت ہوں۔میرے پاس باہر کے کردار ہیں جب میں نے ''پیار کا پہلا شہر'' اور ''جپسی'' تحریر کیے تو لوگ باگ کہنے لگے یہ تو اسپین کا پس منظر ہے تو سمر کند موم نے برٹش پس منظر کی کہانیاں کم لکھی ہیں ملایا،سنگاپور کے پس منظر میں زیادہ لکھی ہیں مثلاً ہیونگ وے نے امریکہ کے پس منظر میں ایک ناول لکھا ہے۔باقی تمام کام دنیا کے مختلف ملکوں اور شہروں کی نمائندگی کرتا ہے۔ہمارے ہاں یہ روایت نہیں ہے ہم تو بس قدیم آبادیوں کے گلی محلے اور ساس بہوؤں کے جھگڑوں تک محدود رہنا چاہتے ہیں۔میرے ناولوں میں پاکستانی معاشرت کی موجودگی کا اندازہ عبداللہ حسین کی اس رائے سے لگایا جا سکتا ہے کہ مستنصر حسین تارڑ پاکستانی معاشرت کا

بائیوگرافر ہے۔۳۷

کرداروں کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مستنصر حسین تارڑ کو کردار تخلیق کرنے میں کتنی خدا داد صلاحیت ہے۔ان کے تخلیق کردہ کرداروں پر وقت کے نمایاں اثرات واضع طور پر محسوس ہوتے ہیں۔کردار تخلیق کرنے میں مستنصر حسین تارڑ کا کوئی ثانی نہیں۔ان کا تخلیق کردہ ہر کردار ایک عہد کی مکمل داستان ہے۔

حواشی وحوالہ جات

۱۔ محمد اشرف کمال،ڈاکٹر،اُردو ناول۔تاریخ و ارتقا(آغاز سے اکیسویں صدی تک)،رنگ پبلی کیشنز،کراچی،سن،۲۰۱۷ء،ص،۳۱۷

۲۔ حمیرااشفاق،جدید اُردو فکشن عصری تقاضے اور بدلتے رجحانات،سانجھ،لاہور،سن،۲۰۱۰ء،ص،۸۷

۳۔ ممتاز احمد،ڈاکٹر،آزادی کے بعد اُردو ناول :ہیئت،اسالیب اور رجحانات،انجمن ترقی اُردو،کراچی،سن،۱۹۹۷ء،ص،۲۸۳

۴۔ مستنصر حسین تارڑ،قلعہ جنگی،سنگِ میل پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۰۸ء،ص،۳۰

۵۔ مستنصر حسین تارڑ سے گفتگو،دانش محمود ،ڈاکٹر قراۃ العین طاہرہ،مشمولہ،تسطیر،شمارہ ،۲،مدیر،نصیر احمد ناصر،لاہور،ص،۷۶

۶۔ ممتاز احمد،ڈاکٹر،آزادی کے بعد اُردو ناول :ہیئت ،اسلوب اور رجحانا ت ،انجمن ترقی اُردو،کراچی،سن،۱۹۹۷ء،ص،۲۸۴

۷۔ مستنصر حسین تارڑ،قلعہ جنگی ،سنگِ میل پبلی کیشنز،لاہور،سن،۲۰۰۸ء،ص ،۶

۸۔ ایضاً،ص،۱۲۵

۹۔ ایضاً،ص،۲۱۵

۱۰۔ ممتاز احمد،خان،ڈاکٹر،آزادی کے بعد اُردو ناول:ہیئت،اسلوب اور رجحانات ،انجمن ترقی اُردو،کراچی،سن ،۱۹۹۷ء،ص،۲۸۵

۱۱۔ ایضاً،ص،۱۱۲

۱۲۔ مستنصر حسین تارڑ،خس وخاشاک زمانے ،سنگِ میل پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۱۳ء،ص،۶

۱۳۔ ایضاً،ص،۱۷

۱۴۔ ایضاً،ص،۱۵۱

۱۵۔ ایضاً،ص،۱۵۵،۱۵۶

۱۶۔ ایضاً،ص،۴۲۳،۴۲۴

۱۷۔ ایضاً،۴۳۶

۱۸۔ مستنصر حسین تارڑ،خس و خاشاک زمانے،سنگِ میل پبلی کیشنز،لاہور،سن،۲۰۰۸،ص،۴۴۸

۱۹۔ ایضاً،ص،۴۷۳

۲۰۔ ایضاً،ص،۵۷۹

۲۱۔ ممتاز احمد،ڈاکٹر،اُردو ناول کے چند اہم زاویے:اضافوں کے ساتھ،انجمن ترقی اُردو ،کراچی،سن۲۰۰۳ء،ص،۲۶۹

۲۲۔ مستنصر حسین تارڑ،خس و خاشاک زمانے،سنگِ میل پبلی کیشنز،لاہور،سن،۲۰۰۸،ص،۴۳۷

۲۳۔ ممتاز احمد،ڈاکٹر،اُردو ناول کے چند اہم زاویے:اضافوں کے ساتھ،انجمن ترقی اُردو ،کراچی،سن۲۰۰۳ء،ص،۲۶۹

۲۴۔ مستنصر حسین تارڑ،خس و خاشاک زمانے،سنگِ میل پبلی کیشنز،لاہور،سن۲۰۰۸ء،ص،۹

۲۵۔ ایضاً،ص،۶۵

۲۶۔ ایضاً،ص،۱۵۶

۲۷۔ ایضاً،ص،۱۶۲

۲۸۔ ایضاً،۵۹

۲۹۔ ایضاً،ص،۷۴،۷۵

۳۰۔ ایضاً،ص،۳۶۴

۳۱۔ ایضاً،ص،۶،۷

۳۲۔ ایضاً،ص،۲۴

۳۳۔ ایضاً،ص،۴۲

۳۴۔ ایضاً،ص،۴۳

۳۵۔ ایضاً،ص،۶۷

۳۶۔ ایضاً،ص،۶۱۶

۳۷۔ مستنصر حسین تارڑ سے گفتگو،گلزار جاوید،مشمولہ، چہار سُو ،شمارہ نمبر،مارچ اپریل،۲۰۱۵ء،مدیر، گلزار جاوید،راولپنڈی،ص،۳۱

باب سوم

قلعہ جنگی اور خس و خاشاک زمانے کے پلاٹ اور تکنیک پر 9/11 اثرات

قلعہ جنگی کے پلاٹ اور تکنیک پر 9/11 کے اثرات

9/11 کا سانحہ بڑی گہری معنویت رکھتا ہے، چونکہ یہ اندوہناک واقعہ امریکی سرزمیں پر ہوا، لیکن اس کے اثرات نے پاکستان کو منفی طور پر بہت متاثر کیا۔ سولہ سال گزرنے کے باوجود بھی اس واقعہ کے پاکستان کی سیاست، سماج، علم اور ادب پر مسلسل اثرات نمایاں ہے۔ اس حوالے سے نجیبہ عارف اپنی کتاب 9/11 اور پاکستانی اردو افسانہ میں رقمطراز ہیں:

> اس پس منظر میں گیارہ ستمبر کا واقعہ، جو اگرچہ پاکستان سے کوسوں دور کسی اجنبی سر زمین پر رونماں ہوا مگر اپنے عالمی ہمہ گیر اثرات، اور پاکستان کی مخصوص سیاسی و دفاعی نوعیت اور جغرافیائی حیثیت کے پیشِ نظر، پاکستان کی سیاست، معیشت، معاشرت، اور شہری زندگی کے امن وسکون پر شدت سے اور منفی طور پر اثر انداز ہوا ہے، اردو فکشن اور شاعری دونوں میں بھر پور طریقے سے رونماں ہوا ہے۔ ورلڈ ٹریڈ سنٹر پاکستان میں واقع نہیں تھا اور ان پر حملہ کرنے والے ملزموں میں سے کوئی بھی پاکستانی ثابت نہیں(۱)

خوبصورت، دلکش، اور چونکا دینے والے تخلیقی ناول کے لیے پلاٹ اور تکنیک بہت اہمیت کے حامل ہیں۔ ایک اچھے اور عمدہ ناول کے لیے ضروری ہے کہ ناول کا پلاٹ اور تکنیک بھی عمدہ ہو۔ ناول میں پلاٹ کی اہمیت کے حوالے سے ڈاکٹر احسن فاروقی اپنی کتاب ناول کیا ہے میں بیان کرتے ہیں:

> پلاٹ میں قصہ نہائیت سلیقہ کے ساتھ ڈھلا ہونا چاہیے۔ ضرورت سے زیادہ واقعات یا حرکات جونفس قصہ سے کم تعلق رکھتے ہیں یک لخت چھانٹ دینا چاہیے۔ پلاٹ بنانا ویسا ہی ہے جیسے کوئی سنگ تراش کچھ خاص فنی قاعدوں کے موافق کسی پتھر کی سل کو تراش کر ایک خوشنما بت کو بنائے مگر خوبی یہ ہے کہ اس میں بناوٹ کا اثر ظاہر نہ ہو جیسے کسی بت تراش کے بت کا اصل سے مطابق ہونا ضروری ہے ویسے ہی پلاٹ کا کسی اصل قصے کے مطابق ہونا بھی ضروری ہے۔ پھر جیسے تراشے ہوئے بت میں حقیقت کے ساتھ حسن یا دلکشی ضروری ہے ویسے ہی

ناول کے پلاٹ میں ایک فنی حسن وخوبی کا وجود لازم ہے۔(۲)

کسی بھی کام کے کرنے کے لیے تکنیک بہت اثر انداز ہوتی ہے،اس تکنیک کا استعمال ورلڈ ٹریڈ کی ۱۱۰ منزلہ عمارتوں کے گرانے کے لیے ہو یا پھر ادب میں کسی فن پارے کے تخلیقی اظہار کے لیے۔گیارہ ستمبر کے سانحہ نے نہ صرف ہمارے تخلیق کاروں کی سوچ کے زاویے کو بدلا بلکہ تخلیقی ناول کے پلاٹ اور تکنیک پر بھی گہرے اثرات مرتب کیے ہیں

اس کی اولین مثال مستنصر حسین تارڑ کا ناول قلعہ جنگی ہے۔اگر اس ناول کا مطالعہ گہرائی اور فکری توانائی کے ساتھ کیا جائے تو یہ واضح ہے کہ قلعہ جنگی کے پلاٹ اور تکنیک پر 9/11 کے گہرے اثرات مرتب ہیں۔

قلعہ جنگی کا پلاٹ مکمل طور پر گیارہ ستمبر کے اثرات پر مشتمل ہے۔واقعات اور کرداروں میں گہرا ربط موجود ہے۔قلعہ جنگی میں گھوڑے کا ہونا اور اس کے متعلق کرداروں کا باتیں کرنا ہی قلعہ جنگی کے پلاٹ کو شروع میں ہی موثر بنا دیتا ہے۔اچھے پلاٹ کی یہ بھی خصوصیت ہے کہ پلاٹ ابتدا سے ہی گہری معنویت رکھتا ہو۔قلعہ جنگی میں یہ خصوصیت موجود ہے۔

گھوڑا ہے

کہاں ہے؟

اوپر....قلعہ جنگی کے صحن میں۔

وہاں گھوڑا کیسے ہوسکتا ہے....لاشوں کو کھانے آیا ہے؟

نہیں ہے...سچ مچ کا گھوڑا ہے.....کان لگا کر سنو(۳)

قلعہ جنگی اور گھوڑے میں بڑی گہری معنویت موجود ہے۔قلعہ جنگی کیا ہے؟اور وہاں گھوڑے کیوں موجود ہے۔اس دلچسپ صورتِ حال کو جاننے کے لیے قاری کی توجہ ابتدا سے ہی ناول پر مرکوز ہو جاتی ہے۔اس کے بعد قاری کی توجہ اور بھی بڑھ جاتی ہے جب قاری کو معلوم ہوتا ہے کہ افغانستان کے شہر مزار شریف میں قلعہ جنگی واقع ہے،جہاں پر امریکہ نے شدید بمباری کی،اور قلعہ جنگی کے تہہ خانے کو لاشوں سے بھر دیا

تھا۔شدید وحشیانہ بمباری کے بعد یہ یقین نہیں کیا جاسکتا تھا کہ قلعہ جنگی کے صحن اور تہہ خانے میں کسی جاندار چیز کا وجود ہو۔لیکن قلعہ جنگی کے صحن میں گھوڑا ہے اور تہہ خانے کے اندر سات مجاہد ہیں جن کی نظریں اب گھوڑے پر ہیں۔

اچھے پلاٹ کی یہ بھی خوبی ہے کہ پلاٹ ان واقعات پر مشتمل ہوتا ہے جو پیش آ چکے ہوں۔اس حوالے سے صاحبزادہ حمید اللہ اپنی کتاب فن اور تکنیک میں بیان کرتے ہیں۔

> ناول میں کرداروں کے بعد اس کا سب سے زیادہ اہم جزو پلاٹ یا خاکہ ہے۔پلاٹ درحقیقت اشخاصِ قصہ کے افعال ،حرکات کا مجموعہ ہوتا ہے۔اس میں وہ تمام واقعات داخل ہوتے ہیں، جو اشخاصِ قصہ سے سرزد ہوں یا محض ذہنی وجود رکھتے ہوں ۔بعض اوقات پلاٹ یعنی ناول کے خاکے ہی کو ناول کے نام سے تعبیر کرتے ہیں ۔کیونکہ کسی عمارت میں اس کا خاکہ ہی دراصل عمارت کی جان ہوتی ہے۔وسیع معنوں میں پلاٹ نہ صرف ان واقعات پر مشتمل ہوتا ہے جو پیش آ چکے ہوں ۔بلکہ جذبات اور خیالات بھی اس کی تعمیر کے اجزا ہوتے ہیں ۔امریکہ کا مشہور افسانہ نگار ایڈگر ایلن پو پلاٹ کے لیے واقعات کیساتھ دلچسپی کی بھی قید لگاتا ہے۔اس کی رائے میں جو پلاٹ ایسے واقعات سے بنے جس میں دلچسپی نام کو نہ ہو پلاٹ کہلانے کا مستحق ہی نہیں۔پلاٹ تمام بلند پایہ ادبی کارناموں کا ضروری جزو ہے۔ رزمیے ،افسانے ،ڈرامہ،سوانح ،اور تاریخ غرض اکثر ادبی کارنامے بغیر پلاٹ کے وجود پذیر ہی نہیں ہو سکتے۔(۴)

قلعہ جنگی کے موثر پلاٹ کی ایک اہم وجہ اس پر گیارہ ستمبر کے اثرات ہیں۔یہ واقعہ پہلے افغانستان میں پیش آ چکا ہے۔لیکن ایک اہم اور حیران کن بات یہ ہے کہ امریکہ کی وحشیانہ بمباری اور کروز میزائلوں کی بارش کی وجہ سے قلعہ جنگی کا تہہ خانہ لاشوں سے بھر گیا تھا،وہاں پر کسی ایک انسان کا بھی زندہ ہونا ناقابلِ یقین تھا۔لیکن اس کے تہہ خانے میں سات مجاہد موجود ہیں جو ہتھیار نہیں ڈال رہے ہیں۔جن کو شہید کرنے کے لیے ہر قسم کے حربے استعمال کیے جا چکے ہیں۔ان کو شہید کرنے کے لیے تہہ خانے کے اندر پانی

چھوڑا گیا، میزائل مارے گئے، کیمیائی گیس کا استعمال کیا گیا، مگر اس کے چار پانچ دن بعد، جب ریڈ کراس کی ٹیم لاشیں اٹھانے آئیں تو ایک مجاہد کا ان پر فائرنگ کرنا حیران کن ہوجاتا ہے۔ یہ وہ سچا واقعہ تھا جس پر مستنصر حسین تارڑ نے قلعہ جنگی کا پلاٹ تیار کیا۔ اس حوالے سے مستنصر حسین تارڑ اپنے ایک انٹرویو میں بیان کرتے ہیں:

> میرا سیاست سے کوئی تعلق نہیں۔ شمالی اتحاد، طالبان سے کوئی واسطہ نہیں، صرف انسان سے رشتہ ہے۔ انسانیت کے ناتے مجھے اِس واقعے سے انتہائی اذیت پہنچی۔ کشمیر، فلسطین، ویتنام، افغانستان، سبھی کو وہاں پر ہونے والے مظالم کا شدید دکھ ہے، میں افغانستان کے متعلق بہت کچھ پڑھتا رہا، الیکٹرانک میڈیا، پرنٹ میڈیا، انٹرنیٹ، میں سبھی سے منسلک رہا۔ میں خصوصی طور پر قلعہ جنگی کے متعلق ایک ایک بات جاننا چاہتا تھا۔ میں اس کے متعلق معلومات حاصل کرتا رہا۔ قلعہ جنگی میں قتل و غارت کے بعد معلوم ہوا کہ قلعہ کے تہہ خانے میں چھ سات طالبان ہیں جو ہتھیار نہیں ڈال رہے۔ ان کو ہلاک کرنے کے لیے راکٹ، پانی پیٹرول، گیس، سب کچھ چھوڑا گیا۔ سارے طریقے استعمال کیے گئے، دو تین دن بعد اس یقین کے سات کہ اب ان میں سے کوئی بھی زندہ نہ بچا ہوگا۔ ریڈ کراس کی ٹیم لاشیں اٹھانے کے لیے آئیں تو ان پر فائرنگ کی گئی، جس سے معلوم ہوا کہ ان میں سے کوئی ایک ضرور زندہ ہے۔ مجھے اس واقعے نے بہت فیسی نیٹ کیا۔(۵)

قلعہ جنگی امریکی بمباری سے مکمل طور پر تباہ ہوچکا ہے۔ وہاں صرف لاشوں کے اور کچھ نہیں ہے۔ ڈیزی کٹر اور بنکر بسٹر آسمان سے نازل ہوئے۔ جنہوں نے مٹی کے آتش فشاں بنا دیے جس میں لوگ دفن ہو گئے۔ قلعہ جنگی کا پلاٹ جنگی تباہی و بربادی کے بحران سے شروع ہوتا ہے، جہاں پر امریکہ قتل و غارت گری کر چکا ہے۔ اس لحاظ سے قلعہ جنگی کے پلاٹ پر گیارہ ستمبر کے نمایاں اثرات موجود ہیں قلعہ جنگی کے اندرونی منظر کو اس طرح بیان کیا گیا ہے:

> سوار اگر یکجا ہو... مجتمع ہو تبھی اس کی پہچان ہوسکتی ہے لیکن ان میں سے بیشتر تو بکھرے پڑے تھے... ان کے اعضاء ایک دوسرے سے روٹھے ہوئے دور دور

> پڑے تھے... بازو کہیں ہتھیلیاں اور دھڑ کا ایک حصہ کہیں اور گل سڑ رہا ہے....اور جو سر ....سر بلند نہیں ہو سکتا وہ کسی کچی دیوار سے ٹیک لگائے لڑھکنے سے بچتا ہے۔بی۔باون طیاروں نے کیا خوب ان کی تقسیم کی تھی۔(۶)

قلعہ جنگی کے پلاٹ پر سانحہ گیارہ ستمبر کے کے اثرات بہت نمایاں ہیں۔ناول کا پلاٹ قتل و غارت گری کے بعد کا ہے۔قتل و غارت گری کے بعد کے تمام واقعات کا آپس میں بہت گہرا ربط ہے۔ناول کی ابتدا کے بارے میں مستنصر حسین تارڑ ایک انٹرویو میں کہتے ہیں

> میرا ناول وہاں سے شروع ہوتا ہے جہاں قتل و غارت گری ہو چکی ہے۔تہہ خانے میں چھ سات نوجوان ہیں جو ہتھیار نہیں ڈال رہے۔یہ ناول انہی چھ سات کرداروں پر مشتمل ہے۔ہیو مین ٹریجڈی اس کا موضوع ہے۔مجھے اس بات کا بھی افسوس ہے کہ اس انسانی المیہ کا شکار تمام غیر ملکی ہیں۔ان میں کوئی مقامی طالبان نہیں ہے۔ان کرداروں میں سب سے بڑا تئیس برس کا ہے۔باقی بیس بائیس برس کے نوجوان ہیں۔(۷)

قلعہ جنگی کے کرداروں کے دوسرے حرکات و عمل بھی پلاٹ پر گیارہ ستمبر کے اثرات کو واضح طور پر عیاں کرتے ہیں، کیونکہ قلعہ جنگی کے یہ سات کردار قلعہ سے باہر نہیں جا سکتے، یا تو چاندنی میں پہچانے جائیں گیا اور یوں آسماں سے کوئی امریکی میزائل، ڈیری کٹر، یا بنکر بسٹر زآ کر ان کو آتش فشاں میں غرق کر دے گا اور یہ کہ اگر آسمان سے امریکی عتاب نازل نہ ہوا تو یہ بھی ممکن ہے شمال والے ان کو دیکھ لیں، یوں دونوں طرح سے ان کو ڈر ہے کہیں وہ مارے نہ جائیں، اس سب پر مستزاد بھوک بھی ان کو موت کی وادی میں دھکیل رہی ہے، جس کے لیے ضروری ہے کہ گھوڑے کو مار کر کھایا جائے، تا کہ چند دن اور زندہ رہ سکیں۔اب گھوڑے کو مارنے کا مسئلہ درپیش ہے۔سات مجاہدوں میں سے کوئی بھی گھوڑے کو مانے کے لیے تیار نہیں ہے۔کردار آپس میں یوں محو گفتگو ہیں:

> گھوڑے کو کون مارے گا؟ چی چی نے نہیں مرتضی نے کہا ..تم گل شیر نہیں یارا، ہمارا طبیت خراب ہے...کلاشنکوف چلانے کو جی نہیں چا رہا...ورنہ ہمارا لوگ

توانسان کو بے دریغ مارتا ہے جانور کیا چیز ہے...بولو چی چی مرتضی بیگ ادھر ہمارے چیچنیا میں گھوڑوں کو اولاد کے برابر درجہ دیتے ہیں بلکہ اس سے بھی بلند....اولاد کو مارنا مشکل ہوتا ہے..کوئی اور بے شک مار دے خود مارنا مشکل ہوتا ہے عبدالوہاب کو بولو یہ بدو لوگ عادی ہوتے ہیں ...عبدالوہاب....اخی چی چی کہتا ہے کہ ان کے ملک میں گھوڑا اولاد کے برابر ہوتا ہے لیکن ایک عرب کے لیے گھوڑا عزت نفس ہوتا ہے....بھائی مجھے آزمائش میں نہ ڈالنا...اللہ بخش جان گیا کہ اب شاید اس کا نام پکارا جائے گا، مجھے پتا ہی نہیں کہ گھوڑے کو کیسے مارتے ہیں...(۸)

تمام کردار بمباری کی وجہ سے شدید زخمی ہیں جبکہ شدید بھوک اور پیاس بھی محسوس ہو رہی ہے۔ان کے جسموں کے اندر ڈیزی کٹر بم کے زہر آلود ٹکرے پیوست ہیں،لیکن گھوڑے کو مارنے کی کوئی بھی جسارت نہیں کر رہا،ان سب کو جیسے اپنی جان سے زیادہ گھوڑا مقدس ہو گیا ہو۔بحث کی تکرار ان کی اپنی ذات تک جا پہنچتی ہے،اس لیے سب ایک دوسرے کو الزامات دیتے ہیں ۔جانی کو کہا جاتا ہے کہ تم ایک گھوڑے کو تو نہیں مار سکتے لیکن انسانوں کو مارنے سے گریز نہیں کرتے۔جانی چونکہ برطانیہ سے تعلق رکھتا ہے اور اس بات کے پردہ میں برطانوی منافقت کو ظاہر کرتا ہے۔یہ بحث کافی طویل ہو کر دوبارہ گھوڑے پر آتی ہے کہ اگر گھوڑے کو نہ کھایا گیا تو کل تک ہمارا زندہ رہنا مشکل ہے۔گھوڑے کو نہ مارنا مجاہدوں کے اس ماحول کی عکاسی بھی کرتا ہے جس میں ان مجاہدوں کی پرورش ہوئی ہے۔

ہاشم کا تعلق بھی برطانیہ سے ہے اس نے برطانیہ میں بھی گھوڑا رکھا ہوا تھا۔اس لیے وہ ایک گھوڑے کو نہیں مار سکتا۔لیکن گھوڑے کو مارنے کے بعد بھی مسئلہ ختم نہیں ہوتا۔اب مسئلہ گھوڑے کو کھانے کا ہے۔اب سوال یہ ہے کہ آیا گھوڑے کو کھایا جا سکتا ہے یا نہیں ؟اس سوال کے بارے میں تمام کردار سوچ و بچار میں ہیں کہ گھوڑا حرام ہے یا حلال۔یہ ساری صورتِ حال افغانستان میں قلعہ جنگی میں محصور لوگوں کے حوالے سے ہے اور پلاٹ کے پہلے حصہ سے تعلق رکھتی ہے،جس سے یہ واضح ہے کہ قلعہ جنگی کے پلاٹ پر گیارہ ستمبر کے اثرات بڑے واضح ہیں

قلعہ جنگی کے پلاٹ میں گیارہ ستمبر کے اثرات کا گہرا منطقی ربط موجود ہے۔اس لحاظ سے دیکھا

جائے تو قلعہ جنگی کا پلاٹ ،اردو ناول کے بہترین پلاٹ میں سے ہے۔قلعہ جنگی میں کہیں بھی گیارہ ستمبر کے اثرات سے ہٹ کر واقعات نہیں ہیں، بلکہ تمام واقعات ،حرکات، گیارہ ستمبر کے اثرات کو ظاہر کرتے ہیں۔ایک عمدہ پلاٹ کی یہی خوبی ہوتی ہے کہ اس میں واقعات اور کرداروں کا آپس میں گہرا ربط ہونا چاہیے ہے،تاکہ کسی قسم کا کوئی جھول پیدا نہ ہو۔اردو میں ایسے ناول بھی تخلیق کیے گئے ہیں جن کا پلاٹ موجود ہی نہیں۔منشی سجاد حسین کا ناول حاجی بغلول ایسا ہی ناول ہے جس کا پلاٹ نہیں ہے۔پلاٹ میں منطقی ربط کے حوالے سے ڈاکٹر محمد یٰسین اپنی کتاب ناول کا فن اور نظریہ میں بیان کرتے ہیں۔

> پلاٹ (plot) ناول کا اہم ترین جز تسلیم کیا جاتا ہے۔اس فن میں مصنف واقعات کی ترتیب سے ہمارے سامنے زندگی کی ایک ایسی جھلک پیش کرتا ہے جس سے ہم نہ صرف لطف اندوز ہوتے ہیں بلکہ انسانی زندگی کے متعلق نئے حقائق کے انکشاف سے بھی بہرہ ور ہوتے ہیں۔ارسطو نے سب سے پہلے اپنی بوطیقہ میں المیہ ڈراموں کے اجزائے ترکیبی پر بحث کرتے ہوئے پلاٹ کو ڈرامہ کی جان قرار دیا تھا۔لیکن ناول میں تمام واقعات یکساں طور پر اہم نہیں ہوتے ۔یہاں مصنف اصول انتخاب(principle of selection) سے کام لیکر محض ان واقعات کو پلاٹ کے تانا بانا میں شامل کرتا ہے جن سے کہانی کے ارتقا یا کردار کے کسی پہلو کو اجاگر کرنے میں مدد ملتی ہے۔مثال کے طور پر اگر ہم یہ کہیں کہ بادشاہ مر گیا اور اس کے بعد ملکہ بھی چل بسی تو یہ کہانی ہوئی جس میں تاریخی تسلسل ہے،لیکن اگر اسی بات کو یوں پیش کریں کہ بادشاہ کی موت کے غم میں ملکہ بھی چل بسی تو یہ انداز ناول کا ہے جس کے پلاٹ میں منطقی ربط کو زیادہ اہمیت حاصل ہوتی ہے۔(۹)

گیارہ ستمبر کے اثرات قلعہ جنگی کے پلاٹ پر مکمل طور پر حاوی ہیں۔چونکہ افغانستان میں جتنے بھی مجاہد تھے،وہ کبھی کسی وقت ایک دوسرے کے لیے بالکل اجنبی تھے۔لیکن پھر یہ کون سی کشش تھی جس کی وجہ سے مجاہد اپنا گھر بار،یار،دوست ،رشتہ دار،بہن بھائی،ماں باپ،اور عیش و عشرت کو چھوڑ کر افغانستان آپہنچے۔بظاہر تو یہ ایک دوسرے کے لیے یکسر اجنبی تھے ،وہ رنگ نسل،ثقافت اور خصلت میں بھی ایک دوسرے

سے مختلف تھے،لیکن ان کا تصورِ کامل ایک ہی تھا جس طرح سویت یونین والوں کے لیے تصورِ کامل ایک تھا،اور دونوں ہی دوسروں کی سرزمین پر اپنے خواب اور تصورِ کامل کو پورا کرنے کے لیے آئے تھے۔لیکن قابل،مزار شریف،آ کر ان کو معلوم ہوا کہ اُن کے مدِ مقابل انہی کے عقیدے کے لوگ تھے،مرتے وقت ان کے منہ سے کلمہ شریف پڑھنے کی آواز آتی،اور وہ جو پرہیز گار نہ تھے،جدید ٹیکنالوجی کے بل بوتے پر ہزاروں فٹ کی بلندیوں سے آگ اور بارود کے گولے برسا کر انسانوں کو آتش فشاں کی آگ میں بھسم کرنے کے کام پر معمور تھے۔

قلعہ جنگی کے پلاٹ کا پہلا حصہ گھوڑے کو دیکھنے سے لیکر گھوڑے کو مار کر کھانے تک کا ہے۔قلعہ جنگی کے پلاٹ کا دوسرا حصہ واقعات کے ساتھ کرداروں کا ہے،جو خارجی اثرات کو جذب کیے ہوئے ہیں۔یہ تعداد میں کل سات ہیں۔ان کرداروں کے شخصی ارتقاء کو دیکھیں تو ان کے شخصی ارتقاء پر بھی گیارہ ستمبر کے اثرات نمایاں ہیں۔جو کسی نہ کسی بہانے یا دوسروں کی باتوں میں آ کر افغانستان آ گئے تھے،کیونکہ ان کے مطابق افغانستان میں جنت بٹ رہی تھی۔قلعہ جنگی کے پلاٹ کے دوسرے حصے میں ہم بیک وقت دو کرداروں مرتضیٰ بیگ،اور گلونائی سے متعارف ہوتے ہیں،جن کا گیارہ ستمبر سے بہت گہرا واسطہ بنتا ہے۔مرتضیٰ بیگ ایک شدید ردِعمل کے نتیجے میں سرحد پار آئے تھے،شاید وہ اپنے والد کے گناہوں کا حساب چکانا چاہتا تھا۔کیونکہ ان کے والد بھی سویت یونین کے دنوں میں چوری چھپے افغانستان آیا کرتے تھے،جن کا تصورِ کامل بدی کی سلطنت کے خلاف جہاد کرنا تھا۔اسی طرح مرتضیٰ بیگ بھی چوری چھپے افغانستان آیا تھا۔مرتضیٰ بیگ نے گلونائی سے موبائل پر بات کی اور ان سے کہا کہ وہ بھی افغانستان جانا چاہتے ہیں۔گلونائی ان کو ساتھ لے جانے کا وعدہ کرتا ہے۔مرتضیٰ بیگ کے کردار کے حوالے سے مستنصر حسین تارڑ بیان کرتے ہیں:

> کوئی ایک ساعت ایسی آ گئی جب مرتضیٰ بیگ نے اپنے کراون کو بوجھل محسوس کیا....زندگی میں پہلی بار اس میں سے سٹنگرز کلاشنکوفوں اور سفید سفوف کی ...اور سیف ہاوس سے لوٹتے والد صاحب کے منہ سے شراب اور ان کے وجود میں رچی جنسی نمی کی نا قابلِ برداشت بو آنے لگی...اور وہ باغی ہو گیا۔(۱۰)

قلعہ جنگی کے پلاٹ کے واقعات اور مرتضیٰ بیگ کے کردار میں گیارہ ستمبر کے حوالے سے گہری

مماثلت پائی جاتی ہے۔وہ چوری چھپے جہادی کیمپ میں جا پہنچا۔یہاں کے شب و روز کے رنگ اور ہی تھے۔یہ زندگی پہلی زندگی سے مختلف تھی، جہاد کی ٹریننگ،پنجگانہ نماز،تسبیح،وعظ،اور ہتھیاروں کے استعمال کی موثر تربیت ،خوراک ،رہائش،اور پیسے سب کچھ وافر تھا۔اب مرتضٰی بیگ قندوز میں ایک کلاشنکوف سنبھالے ایک گہری کھائی میں چھپ کر ان دیکھے دشمن پر فائر کرتا۔مرتضٰی بیگ کو جہادی کیمپ میں لانے والا گلونائی تھا، جو کہ خود ایک پڑھا لکھا نوجوان تھا،مغربی موسیقی کا شدید شوقین،نفیس لباس پہننے والا،اور پھر اچانک ایسی رنگین دنیا سے تعلق توڑ کر جنت کے حصول کے لیے افغانستان جا پہنچا۔

دوسرے کرداروں پر بھی گیارہ ستمبر کے اثرات موجود ہیں۔ابو طالب جس کا تعلق چیچنیا کے قریب داغستان کی سرحد کے قریب ایک گاؤں سے ہے۔ان کو ان کی دادی نفیسہ نے پالا تھا۔اپنے کامل تصور کو پورا کرنے کے لیے یہ بھی قندوز میں آ گیا جو اب شدید زخمی حالت میں قلعہ جنگی کے تہہ خانے میں موجود ہے۔

قلعہ جنگی کے پلاٹ اور کرداروں پر گیارہ ستمبر کے واقعات آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ منسلک ہیں۔وہ قلعہ جنگی کے تہہ خانے میں محصور ہیں۔شدید بھوکے اور پیاسے ہیں،گھوڑے کو مار دینے کے بعد بھی وہ گھوڑے کو نہ کھا سکے،اور اب صرف اپنی اپنی موت کا انتظار کر رہے ہیں۔ان کا جسم گولیوں سے چھلنی ہے ،ڈیزی کٹر بم کے ٹکڑے ان کے جسموں میں پیوست ہیں۔کسی کے معدے کے پاس گولی آ کر ٹھہر گئی جس سے نظامِ اخراج متاثر ہے،تو کسی کا پاؤں حرکت کرنے سے قاصر ہے،کوئی بے ہوش ہو کر ابدی نیند کی تیاری میں ہے،کوئی اپنی زندگی کا امتحان ختم ہونے کے انتظار میں ہے۔جن میں کچھ سکت باقی تھی وہ بار بار گھوڑے کا گوشت کھانے کی کوشش کرتے ،لیکن ہر دفعہ ابکائی کی وجہ سے گوشت کو اپنے منہ سے دور کر دیتے۔یہ چند دنوں کے مہمان ہیں۔اس قلعہ جنگی میں ان کو اپنی موت کا یقین مستحکم ہے۔لیکن ابدی زندگی میں جانے سے پہلے وہ اپنی سابقہ زندگیوں کو بھی یاد کرتے ہیں۔اپنے علاقوں کی خصوصیات اور آب ہوا کو بھی یاد کرتے ہیں۔کوئی اپنی دادی نفیسہ کو یاد کرتا ہے تو کوئی اپنے دِیر کے مالٹوں کو یاد کرتا ہے۔کسی کو برطانیہ کی آئس کریم یاد آ رہی ہے تو کوئی اپنے ملک کی جھیل میں نہانا چاہتا ہے۔ان کرداروں اور واقعات کے آپس کے گہرے منطقی ربط سے واضح ہوتا ہے کہ قلعہ جنگی کے پلاٹ پر گیارہ ستمبر کے کتنے وسیع اثرات ہیں۔یہ کردار قلعہ جنگی تک کیسے آئے اس حوالے سے مستنصر حسین تارڑ لکھتے ہیں

> ان میں ایک نے ایک بونے کے کہنے پر ادھر کا رخ کیا۔ایک بدی کی سلطنت کو اپنے تئیں منتشر کر دینے والے باپ کا بیٹا تھا....کوئی شریعت یا شہادت کے شوق میں یہاں پہنچ گیا...گھریلو زندگی کی بدی سے فرار حاصل کرنے والا بھی یہیں نیم مردہ تھا۔کسی کو گروزنی کا امتحان چکانے اور امام شامل کے خواب کو پورا کرنے کی فکر تھی۔(۱۱)

ان کرداروں کی سابقہ زندگی بھی اس بات کی عکاس ہے کہ قلعہ جنگی کے پلاٹ پر گیارہ ستمبر کے اثرات کس قدر نمایاں ہیں۔ان کرداروں کی سابقہ زندگی کا تعلق سویت یونین سے بھی رہ چکا تھا۔جس کو ہم گیارہ ستمبر کا ماقبل بھی کہہ سکتے ہیں۔ان کرداروں میں اللہ بخش ایک بونے کے کہنے پر جہاد میں شامل ہوا، ہاشم میر کو ال منصور لیکر آیا،گل شیر ایک مولوی کی تقریر سن کر جہاد میں شریک ہوا،مرتضیٰ بیگ اپنے والد کے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے آیا تھا،ابو طالب امام شامل کے خواب کو پورا کرنے آیا، جانی واکر برطانیہ سے آیا،عبدالوہاب کو ان کی تعلیم نے مروجہ بادشاہی نظام کے خلاف بغاوت پر اکسایا۔ان واقعات اور کرداروں کا منطقی ربط قلعہ جنگی کے پلاٹ پر گیارہ ستمبر کے اثرات کی عکاسی کرتا ہے۔قلعہ جنگی کا منطقی انجام بھی قلعہ جنگی کے پلاٹ پر گیارہ ستمبر کے اثرات کو ظاہر کرتا ہے۔قلعہ جنگی پر امریکی وحشیانہ بمباری کے بعد بھی امریکی فوج تہہ خانے کے اندر داخل نہ ہو سکی۔وحشیانہ بمباری کے بعد تہہ خانے میں پیش آنے والی صورتِ حال کو یوں بیان کیا گیا ہے:

> اور اسی ساعت میں جب اس نے یہ کہا کہ میں تم میں سے نہیں ہوں،عبدالحمید جان واکر کی انگلی پھر سے مردہ ہوگئی.....اس کی آنکھیں بھی مردہ ہوگئیں لیکن انہوں نے بینائی کھو دینے سے قبل شگاف میں سے نظر آتے آسماں پر ایک پرندہ تیرتے دیکھا اور پھر وہ گرا اور اسی پانی میں ڈوبنے لگا جس میں اس کے ساتھیوں کے لاشے اور غلاظت اور اور بارود کی بو تیرتی تھی ....ڈوبتے ہوئے اس نے گھوڑے کی تھوتنی کو ایک تھپکی دینے کی سعی کی....براونی (۱۲)

قلعہ جنگی کے پلاٹ میں گیارہ ستمبر کی واقعات کی ترتیب ،ربط ،اور منطقی انجام قلعہ جنگی کے پلاٹ پر گیارہ ستمبر کے اثرات کی حقیقی تصویر کشی کرتے ہیں۔

قلعہ جنگی کی تکنیک پر 9/11 کے اثرات

جدید طرز زندگی اور رونما ہونے والے واقعات نے ناول کے اندازِ تحریر اور تکنیک میں بہت زیادہ تنوع پیدا کیا ہے۔ اکیسویں صدی کے مسائل اور واقعات کے پس منظر میں لکھے گئے ہر ناول میں کسی نہ کسی تکنیک کا استعمال کیا گیا ہے۔ کسی مواد کو نئے سانچے میں پیش کرنا تکنیک کی تعریف میں آئے گا۔ جس ناول میں جتنی اچھی تکنیک ہو گی وہ ناول بھی اتنا ہی دلچپ ہو گا۔ اچھی تکنیک کے لیے ضروری ہے کہ اُسلوب، مواد بھی اچھا ہو، ورنہ اچھی سے اچھی تکنیک میں بھی دلچسپی پیدا نہ ہو گی۔ تکنیک کی تعریف ڈاکٹر سلیم اختر اپنی کتاب تنقیدی اصلاحات: توضیحی لغت میں یوں بیان کرتے ہیں:

> ادب اور فنونِ لطیفہ (جیسے مصوری، مجسمہ سازی، رقص، موسیقی) میں مواد کی پیشکش کا انداز۔
>
> تکنیک کو ایسا سانچہ سمجھنا چاہیے جس میں مواد بھر دیا جائے جیسے درزی کپڑے کو کاٹ کر مخصوص صورت دیتا ہے۔ اس مثال سے تکنیک کو سمجھا جا سکتا ہے۔
>
> تکنیک سے ہی صورت پذیر ہو کر مخصوص صورت حاصل کرتی ہے غزل جس تکنیک میں لکھی جائے گی اس میں قطعہ یا رباعی نہیں لکھی جا سکتی۔
>
> تکنیک سے ہی، داستان، افسانہ، ناول اور ناولٹ میں امتیاز پیدا ہوتا ہے۔ تکنیک مواد کی مخصوص صورت پذیری کا باعث ہے لیکن اس کے باوجود یہ جامد یا مطلق نہیں بلکہ اسے متحرک، لچکدار، اور اسی لیے اضافی سمجھنا چاہیے۔ اسے اس مثال سے سمجھئے کہ افسانہ، بیانیہ، علامتی، تجریدی، یا استعاراتی تکنیک میں لکھا جا سکتا ہے۔ وہ افسانہ تو رہے گا لیکن تکنیک کی بناء پر اس کی شناخت جداگانہ ہو گی۔ (۱۳)

افسانے کے ذیل میں ممتاز شیریں اپنی تنقیدی کتاب معیار میں تکنیک کو اس طرح بیان کرتی ہیں:

> تکنیک کی صحیح تعریف کرنا ذرا مشکل ہے۔ مواد، اُسلوب اور ہیت سے علیحدہ صنف۔ فن کار مواد کو اُسلوب سے ہم آہنگ کر کے اُسے ایک مخصوص طریقے سے متشکل کرتا ہے۔ افسانے کی تعمیر میں جس طریقہ سے مواد ڈھلتا جاتا ہے وہی

> تکنیک ہے ۔مثلاً ایک برتن بنانے کے لیے سب سے پہلے مٹی کی ضرورت ہے ۔اِسے خام مواد سمجھ لیجیئے ۔پھر اس میں رنگ ملایا جائے گا۔یہ اُسلوب ہے۔پھر کاری گر مٹی اور رنگ کے اس مرکب کو اچھی طرح گوندھتا ہے،توڑتا ہے،مروڑتا ہے ،دباتا کھینچتا،کسی حصے کو گول،کسی کو چورکور،کہیں سے لمبا کہیں سے گہرا،اور مخصوص شکل پیدا ہونے تک اسی طرح ڈھالتا چلا جاتا ہے۔تکنیک کے لیے یہ ایک موٹی سی مثال ہے۔اور آخر میں جو شکل پیدا ہوتی ہے اسے ہیت کہتے ہیں اور آخر میں جو چیز بنتی ہے وہ افسانہ.....(۱۴)

گیارہ ستمبر کے سانحہ کے اثرات جس طرح قلعه جنگی کے پلاٹ پر مرتب ہوئے ہیں اسی انداز سے قلعه جنگی کی تکنیک پر بھی نمایاں ہیں ۔قلعه جنگی میں گیارہ ستمبر کے اثرات کے حوالے سے کئی اور مختلف تکنیک کا استعمال کیا گیا ہے، جو قلعه جنگی کو شناخت کے حوالے سے دوسرے ناولوں سے ممتاز کرتا ہے۔قلعه جنگی میں مواد کی پیشکش جدت طرازی کی بھی عمدہ مثال ہے۔

رمزیت قلعه جنگی کی پہلی تکنیک ہے۔اگر عنوان پر غور کیا جائے تو اس میں گہری رمزیت موجود ہے۔افغانستان شروع سے ہی کارزار میدان رہا ہے۔خصوصاً بڑی طاقتوں کے حوالے سے۔سویت یونین کے وقت بھی یہی سرزمین کارِزار بنی۔لیکن نہ ہی روس اس پر مکمل قبضہ کرنے میں کامیاب ہوا اور نہ ہی امریکہ۔ناول کا عنوان قلعه جنگی ہے جو افغانستان کی مضبوطی اور مزاحمت کی تاریخ کی طرف اشارہ کرتا ہے۔اس حوالے سے ڈاکٹر ممتاز احمد اپنی کتاب اردو ناول کیے ہمه گیر سرو کار میں بیان کرتا ہے:

> کیا ایسا محسوس نہیں ہوتا کہ قلعہ جنگی علامت ہے ایک ایسی مسلح مزاحمت کا جس کے انجام اور جس کی سچائی کے بارے میں کچھ کہنے سے عقل قاصر ہے۔(۱۵)

قلعه جنگی کی دوسری رمزیت کو گھوڑے کے ذریعے پیش کیا گیا ہے۔جو گیارہ ستمبر کے بعد افغانستان میں امریکی مفادات کی طرف اشارہ ہے۔اس میں یہ رمزیت بڑی گہرائی کے ساتھ پیش کی ہے۔گھوڑے کی علامت سارے ناول پر محیط ہے۔جو افغانستان کی جنگی اور بحرانی صورتِ حال کو بڑے ہی موثر اور ترتیب سے ظاہر کرتی ہے۔امریکہ شروع سے ہی افغانستان کو بڑا کار آمد تصور کرتا تھا۔اس لیے امریکہ کی

افغانستان پرنظر بہت پہلے سے ہی مرکوز تھی۔اس بات کی پیشن گوئی جان، کے کولی نے اپنی کتاب غیر مقدس جنگیں میں بھی کی ہے،حالانکہ یہ کتاب گیارہ ستمبر کے حملے سے بہت پہلے سویت یونین کے دور میں لکھی گئی تھی۔اسی طرح قلعہ جنگی کے تہہ خانے میں موجود سات مجاہدوں کی نظر بھی قلعہ جنگی کے صحن میں موجود گھوڑے پر ہے۔امریکہ کی افغانستان پرنظر اور مجاہدوں کی گھوڑے پرنظر میں بڑی ہی مماثلت اور مطابقت موجود ہے، جو افغانستان میں امریکی مفادات کو ظاہر کرتی ہے۔

یہ تسلسل سارے ناول میں پھیلا ہوا ہے۔اس کے بعد اسی رمزیت کا تسلسل امریکہ اور اس کے مغربی اتحادیوں کی شکل میں بیان کیا گیا ہے۔افغانستان پر حملہ کرنے سے پہلے امریکہ اپنے اتحادیوں سے صلاح مشورہ کرتا رہا کہ افغانستان پر حملہ کرنا چاہیے یا نہیں،اگر امریکہ افغانستان پر حملہ کرتا ہے تو اس کا ردِعمل کیا ہوسکتا ہے۔کئی دن تک امریکہ اور اس کے اتحادی اسی To be or not to be کے تجسس میں گھرا رہا۔ To be or not to be کا یہی تجسس قلعہ جنگی میں محصور مجاہدوں میں موجود ہے،کیونکہ اِن مجاہدوں میں سے کوئی بھی گھوڑے کو مارنے یا فائر کرنے پر راضی نہیں ہے۔اس حوالے سے مجاہد آپس میں یوں بحث و مباحثہ کرتے ہیں:

> گھوڑے کو کون مارے گا؟ چی چی نے نہیں مرتضٰی نے کہا ہم گل شیر...نہیں یارا
> ....ہمارا طبیت خراب ہے...کلاشنکوف چلانے کو جی نہیں چاہ رہا...ورنہ ہمارا لوگ
> تو انسان کو بے دریغ مارتا ہے جانور کیا چیز ہے...بولو چی چی....مرتضٰی بیگ اُدھر
> ہمارے چیچنیا میں گھوڑوں کو اولاد کے برابر درجہ دیتے ہیں، بلکہ اُس سے بھی بلند
> ....اولاد کو مارنا مشکل ہوتا ہے....کوئی اور بے شک مار دے خود مارنا مشکل ہوتا ہے
> عبدالوہاب کو بولو....یہ بدی لوگ عادی ہوتے ہیں۔عبدالوہاب بھی چپ رہا...بولو
> عبدالوہاب اخی چی چی کہتا ہے کہ اُن کے ملک میں گھوڑا اولاد کے برابر ہوتا ہے
> لیکن ایک عرب کے لیے گھوڑا عزت نفس ہوتا ہے۔ (۱۶)

گیارہ ستمبر کے بعد امریکہ نے خود ساختہ دہشت گردی کی بنیاد پر باقاعدہ نام نہاد جنگ کا اعلان کردیا، اور یہ بھی کہہ دیا کہ اِس جنگ میں جو ہمارا ساتھ نہ دے گا اُس کو امریکہ مخالف تصور کیا جائے گا۔مغربی معاشروں کو مغربی پالیسی ساز یہ باور کراتے رہے کہ آپ کی سلامتی کے لیے ضروری ہے کہ افغانستان پر حملہ کیا جائے،آپ کے پُر

امن زندگی بسر کرنے کے لیے ضروری ہے افغانستان کے بچے بچے تک کو ختم کردیا جائے، ورنہ آپ کے معاشروں اور زندگیوں کو شدید خطرات لاحق ہیں۔یعنی دوسروں کے مال و دولت پر قبضہ کر کے شان سے زندگی گزاری جائے۔یہی صورتِ حال ناول میں مجاہدوں کو درپیش ہے، کہ اگر گھوڑے کو مار کر کھالیا جائے تو ہم چند دن اور مزید زندہ رہے سکتے ہیں، ورنہ ہم اگلے دن کو نہیں پکڑ سکتے بلکہ شاید آج رات ہم نہ رہے سکیں۔رمزیت کی اس تکنیک کے ذریعے امریکہ کے مخفی سیاسی حقائق کو پیش کیا گیا ہے۔

رمزیت کی اس تکنیک کا تسلسل آگے بھی برقرار ہے جو افغانستان پر امریکی حملے کو ظاہر کرتی ہے۔گیارہ ستمبر کے بعد امریکہ نے آخر کار باقاعدہ افغانستان پر حملہ کردیا تاکہ جلد از جلد افغانستان پر قبضہ کر کے معدنی ذخائر پر قابض ہو کر مادیت پسندی کی بھوک کو بھسم کیا جا سکے۔ناول میں طویل بحث و مباحثہ کے بعد بالآخر عبدالحمید جان واکر کی انگلی کلاشنکوف کی لبلبی پر دب جاتی ہے، جو کئی دنوں سے ساکت تھی، اچانک حرکت میں آتی ہے اور گھوڑے کا بھاری وجود کے گرنے کی آواز سنائی دیتی ہے۔امریکہ کا افغانستان پر حملہ اور گھوڑے کو گولی مار کر ہلاک کرنے کی تکنیک میں گہری مماثلت ہے، جو گیارہ ستمبر کے اثرات کو ظاہر کرتی ہے

امریکہ افغانستان کے مقابلہ میں بہت طاقتور ملک ہے۔دونوں کی طاقت میں تناسب کا بہت زیادہ فرق ہے۔ایک طرف بہت امیر اور ہر طرح کی جدید ٹیکنالوجی سے آراستہ اور دوسری طرف افغانستان جیسا ملک جہاں پہلے ہی لوگ غربت کا شکار ہیں، لیکن طاقت کے اس غیر معیاری تناسب کے باوجود امریکہ نے تنہا افغانستان پر حملہ نہیں کیا بلکہ اپنے اتحادیوں کو ساتھ ملا کر حملہ کیا۔اسی طرح گھوڑے کو بھی پکڑنے کے لیے ایک مجاہد نہیں جاتا بلکہ کئی مجاہد مل کر گھوڑے کو پکڑنے جاتے ہیں۔یہ علامت نگاری بھی ناول کی تکنیک پر گیارہ ستمبر کے اثرات کو نمایاں کرتی ہے

اختتام پر رمزیت کی یہ تکنیک اپنے کمال درجے پر پہنچ جاتی ہے۔امریکہ نے وحشیانہ بمباری کے بعد افغانستان پر کنٹرول سنبھال لیا۔لیکن اس سب کے باوجود امریکہ افغانستان میں اپنے مخفی سیاسی مقاصد میں کامیاب نہ ہو سکا، قبضہ کرنے کے بعد بھی امریکہ افغانستان کو نگل نہ سکا۔یہی مماثلت مجاہدوں میں نظر آتی ہے، جو گھوڑے کو مار کر بھی کھانے میں کامیاب نہ ہو سکے، اور اب اُن کے سامنے گھوڑا یوں پڑا تھا جیسے سنگ تراش کا شاہکار ہو۔علامت کی اس تکنیک میں گیارہ ستمبر کے تمام اثرات کا نچوڑ پیش کیا ہے

ناول کے اختتام پر یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ امریکی حملہ کے بعد اب افغانستان ایک کھنڈر کے سوا کچھ نہیں۔ یہ کسی کام کا نہیں رہا بالکل اسی طرح تہہ خانے میں مردہ گھوڑا پڑا ہوا ہے جو کھانے میں کام نہ آسکا ،اور اب بے کار تہہ خانے کے پانی میں ڈبکیاں کھا رہا ہے۔رمزیت کی یہ تکنیک استعارے کی صورت میں گیارہ ستمبر کے اثرات کو بڑے ہی تجسس اور پُر تاثیر انداز مین نمایاں کرتی ہے

کسی ناول کا جاذب آغاز بھی تکنیک کے زمرے میں آتا ہے۔ناول کا آغاز ایسے جملے سے ہو کہ فوراً قاری کی توجہ اپنی طرف کھینچ لے۔افسانے میں تو اس کی بہترین مثال'' آنندی''ہے،ناول کا آغاز بلدیہ کے ہنگامی اجلاس سے شروع ہوتا ہے۔قاری کی توجہ فوراً اس طرف مرکوز ہو جاتی ہے کہ اجلاس کیوں منعقد ہو رہا ہے اور اس کا حتمی نتیجہ کیا ہوگا۔قلعہ جنگی میں بھی اس تکنیک کا استعمال کیا گیا ہے،ناول کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:

گھوڑا ہے

کہاں ہے؟

اوپر...قلعہ جنگی کے صحن میں (۱۷)

قاری کی توجہ فوراً اس طرف مرکوز ہو جاتی ہے کہ اگر گھوڑا قلعہ جنگی کے صحن میں ہے تو اس میں اہم بات کیا ہے،لیکن بعد میں پتا چلتا ہے کہ کچھ مجاہدین اس گھوڑے کو کھانے کی بات کر رہے ہیں ، کیونکہ کچھ مجاہدین زخمی حالت میں کئی روز سے بھوکے اس تہہ خانے میں موجود ہیں جو گھوڑے کو مار کر کھانے کی بات کر رہے ہیں۔آغاز بھی دلچپ ہے اور تکنیک پر گیارہ ستمبر تک کے اثرات کا بھی پتا دیتی ہے،کیونکہ قلعہ جنگی افغانستان میں ہے جو اب میدانِ جنگ بنا ہوا ہے۔

قلعہ جنگی میں مکالمہ کی تکنیک بھی بڑی پُر تاثیر ہے۔اس میں کرداروں کی طویل گفتگو ہے۔اور گیارہ ستمبر کی صورتِ حال کے بعد مختلف پہلوں پر بات کرتے ہیں ،لیکن اس مکالمے کے ساتھ ساتھ کرداروں کی حرکات وسکنات بھی جاری ہے ۔ گیارہ ستمبر کی صورتِ حال پر کرداروں کی یہ طویل گفتگو ناول کے اختتام تک جاری رہتی ہے۔اس لحاظ سے قلعہ جنگی کی اس تکنیک پر گیارہ ستمبر کے تمام اثرات نمایاں طور پر سامنے آتے ہیں۔

قلعہ جنگی میں تینوں زمانے حال ، ماضی ،اور مستقبل کو ایک ساتھ پیوست کر کے بیان کیا گیا

ہے۔یہ قلعہ جنگی کی زبردست تکنیک ہے۔اس تکنیک میں گیارہ ستمبر کا سانحہ ماضی میں پیش آ چکا ہے،اس کا اثر ماضی میں افغانستان پر امریکی حملہ ہے۔قلعہ جنگی کے تہہ خانے میں ساری صورتِ حال کو زمانہ حال میں پیش کیا گیا ہے۔لیکن اس کے بعد مصنف مستقبل کے بارے میں سوچتا ہے کہ قلعہ جنگی کے تہہ خانے کے مردوں کے بارے میں بھی کسی بزرگ کو خواب میں آئے گا،جس کے بعد اس تہہ خانے کے مردوں کی دریافت ہو سکے گی یا سب متروک ہو جائے گا،اور اس کے اوپر کوئی نیا مزار شریف یا کوئی نیا قلعہ جنگی تعمیر ہو گا۔اس سے یہ بخوبی ظاہر ہوتا ہے کہ گیارہ ستمبر کا اس تکنیک پر کتنا گہرا اثر ہے۔

قلعہ جنگی میں ایک اور نہایت پُر لطف تکنیک کا استعمال کیا گیا ہے۔گیارہ ستمبر کا واقعہ زمانہ ماضی میں ہو چکا ہے،لیکن تہہ خانے میں موجود زخمی کرداروں کی گفتگو اور عمل گیارہ ستمبر کے واقعہ کو ذہن سے رفو نہیں ہونے دیتے۔ذہن میں مسلسل گیارہ ستمبر،طالبان،اور شمالی اتحاد کا تصور موجود رہتا ہے مثلاً

> نہیں گل شیر....ہم زندہ نہیں...مر چکے ہیں...دوبارہ زندہ نہیں ہو سکتے...ہم اُن کے ہم وطن نہیں،غیر ہیں...اُنہوں نے...ہمارے طالبان اور شمال والوں نے پھر سے گھل مل جانا ہے،لیکن نیچے جو مزار شریف کے شمالی ہیں وہ ہمیں معاف نہیں کر سکتے ،طالبان کو معاف کر دیں گے...وہ ہمیں زیادہ ذمہ دار سمجھتے ہیں...انہوں نے ہمارے ہاتھ پاؤں باندھ کر سر میں گولی مار کر غلاظت کے ڈھیروں پر پھینک دینا ہے کہ ہم وہ غیر لوگ تھے جو اپنا ملک چھوڑ کر اُن کے ملک میں اپنے خواب پورے کرنے آئے تھے۔(۱۸)

قلعہ جنگی چند دنوں کا ناول ہے،لیکن اس کا کینوس بہت وسیع ہے۔اردو ادب میں اس کی ایک مثال سجاد ظہیر کا ناول لندن کی ایک رات ،ایک رات پر مشتمل ناول ہے۔اسی طرح کرشن چندر کا ناول شکست صرف تین دن پر مشتمل ناول ہے۔انگریزی ادب میں ارنسٹ ہیمنگ وے کا *For whom the bell tolls* صرف تین دن کا ناول ہے۔قلعہ جنگی بھی چند دنوں کا ناول ہے،لیکن گیارہ ستمبر کے اثرات نے اس کا کینوس بہت وسیع کر دیا ہے،جس میں ماضی کا اثر حال میں دکھایا گیا ہے۔گیارہ ستمبر کے گھمبیر مسائل کے اثرات اس تکنیک پر بھی تواتر سے موجود ہیں

ناولوں میں اتحادِ زماں و مکاں کی تکنیک بھی استعمال کی جاتی ہے ۔اردو میں اس کا زیادہ تر استعمال افسانوں میں ملتا ہے ۔لیکن جدید ناولوں میں اس تکنیک کا استعمال بڑا ہی جاذبِ نظر ہے ۔اس تکنیک کے حوالے سے ممتاز شیریں اپنی کتاب معیار میں لکھتی ہیں

> اتحادِ زماں و مکاں کے نظریے کی اب وہ اہمیت نہیں رہی ۔وقت اور مقام میں بڑا گہرا تعلق ہے۔ایک خاص وقت میں ایک آدمی ایک ہی مقام پر ہوسکتا ہے اس لیے وقت کا تسلسل ٹوٹنے پر مقام کا تسلسل بھی ٹوٹ جاتا ہے۔چنانچہ یولی سیلس کا ہیرو دورانِ سفر ناول میں تو ڈبلن میں مقیم ہے لیکن ڈبلن کی گلیوں میں چلتے چلتے اس کا ذہن ماضی کی طرف چلا جاتا ہے اور وقت کے ساتھ ساتھ مقام بھی بدل جاتا ہے ...انسانی دماغ میں گزستہ واقعات بھی سما جاتے ہیں ،ماضی کی یادیں بھی محفوظ ہوتی ہیں اور تخیل مستقبل کی طرف بھی لے اڑتا ہے۔(۱۹)

قلعہ جنگی میں بھی اتحادِ زماں ومکاں کی تکنیک کو برتا گیا ہے۔ویسے تو اس کے سارے کردار قلعہ جنگی کے تہہ خانے میں محصور ہیں ۔لیکن کئی دفعہ وہ اپنے ماضی میں بھی چلے جاتے ہیں ۔جس میں اُن کی سابقہ زندگیوں کی جھلکیاں اور گیارہ ستمبر کے اثرات نظر آتے ہیں مثلاً گل شیر ولی جو قلعہ جنگی کے تہہ خانے میں محصور ہے اور ڈیزی کٹر بم کا ایک ٹکڑا اِس کے معدے کے آس پاس کہیں آکر ٹھہر گیا ہے ۔اِس شدید تکلیف کے باوجود اپنے دِیر جاتا ہے اور تہہ خانے میں چاندنی کو دیکھ کر دِیر کی چاندنی کو یوں یاد کرتا ہے :

> ہاں یارا مرنا ہے اُس کی ہنسی میں ایک فاتر العقل ہیجان تھا،یارا اوپر یا نیچے مرنا ہے تو بندہ اس کافر چاندنی میں مرے۔ہم تھوڑا مزہ کرتا ہے ۔نظارہ کرتا ہے یارا...دِیر میں بھی ایسا چاندنی ہوا کرتا تھا۔(۲۰)

اسی طرح جب اللہ بخش کو پیاس تنگ کرتی ہے تو وہ اپنی نانی رحمت بی بی کے پاس جاتا ہے ۔اللہ بخش بیان کرتا ہے

> نہیں بھائی مرتضٰی اب یہ حربہ کام نہیں کرتا...میں اتنی بار خیال ہی خیال میں اپنی نانی جان کے پاس گیا ہوں کہ گرمیوں کے روزے ہیں پیاس سے میرا حبشہ کیکر کا

> کانٹا ہو رہا ہے اور وہ ڈوری میں چھلکے اتارے بادام گھوٹ رہی ہے ۔پھر اُن میں دودھ ملاتی ہے اور ابھی سورج سر پر ہے اور وہ کہتی ہے اللہ بخش پتر تو ابھی بال ہے ...تیرہ روزہ آدھا ہے،اس لیے کھول لے ...میں تانبے کا بھاری گلاس منہ سے لگا کر وہ دودھیا گاڑھا دودھ غٹ غٹ پی جاتا ہوں اور میرا حلق ٹھنڈا ہرا ہو جاتا ہے ۔پر اب یہ حربہ بیکار ہو گیا ہے ۔کام نہیں کرتا ... پہلے خیال ہی خیال میں پیاس بجھ جاتی تھی اور میں اس تہہ خانے میں بھوکا پیاسا نانی جان کے ہاتھوں کا بنایا ہوا دودھ اپنے حلق میں اترتا محسوس کرتا ۔لیکن اب نہیں میرا حبشہ کیکر کے کانٹوں سے بھرا رہتا ہے ... پیاس مجھے خشک کرتی ہے۔(۲۱)

اسی طرح باقی کردار بھی جو تہہ خانے میں زخمی حالت میں پڑے ہوئے ہیں اپنے اپنے آبائی علاقوں میں جاتے ہیں ،جس سے اِن کا تعلق سابقہ زندگی سے جوڑ جاتا ہے ۔اس تکنیک کے استعمال سے پلاٹ کے ربط پر بھی کوئی اثر نہیں پڑتا ۔اتحادِ زماں ومکاں کی اِس تکنیک پر بھی گیارہ ستمبر کے اثرات کا ربط اور تسلسل موجود ہے۔

ناول میں Stream Of Consciousness سے ملتی ایک اور نئی اصطلاح کا بھی استعمال کیا گیا ہے ۔یعنی ماضی کے عکس کی ہو بہو تصویر کشی کر کے پھر سے حال کی طرف لوٹ آنا ۔لیکن اِس تکنیک میں کردار کی بجائے خود مصنف ماضی کی طرف چلا جاتا ہے ۔مثلاً مصنف سویت یونین کے دور کو، جسے ہم گیارہ ستمبر کا ماقبل بھی کہہ سکتے ہیں اور جو کہ ماضی کا حصہ ہے اِن الفاظ میں بیان کرتے ہیں

> افغانستان میں'' ایول ایمپار'' کے خاتمے کے لیے ایک مقدس جنگ میں حصہ لینے والے مجاہدین کے لیے اسلحہ صرف کنٹینرز میں ہی نہیں ٹرینوں بھی آتا تھا.رائفلیں ،مشین گن ،راکٹ لانچر،مارٹر شیل ،سب کے سب چینی ساخت کے ہوتے تھے لیکن یہ چین کی جانب اُس کے حریف سویت یونین سے برسرِ پیکار مجاہدین کے لیے ایک تحفہ یا صرف خیر سگالی کے جذبات کا اظہار نہیں ہوتا تھا بلکہ اِس کی ڈالروں میں ادائیگی انکل سام اپنے پیسے سے کرتا تھا...چینی نہ صرف روسیوں کی حزئمیت کا باعث بن رہے تھے بلکہ پکے کاروباریوں کی مانند بے مثال منافع بھی

کمارہے تھے(۲۲)

اس تکنیک میں گیارہ ستمبر کا ماقبل سو یت یونین اور گیارہ ستمبر دونوں کے اثرات ظاہر ہوتے ہیں ۔ ناول میں کرداروں کا طویل تعارف بیان کر کے مستنصر حسین تارڑ نے ایک نئی تکنیک کا اِستعمال کیا ہے۔جس سے گیارہ ستمبر کے اور بہت سے حقائق سامنے آتے ہیں۔یہ بالکل ایک نئی تکنیک ہے جو قلعہ جنگی کا حصہ بنی ہے

پہلا تعارف مرتضٰی بیگ کا ہے۔جو چوری چھپے افغانستان آیا تھا۔اِن کے والد ارتضٰی بیگ بھی سویت یونین کے وقت اسلحہ کی سپلائی جیسی اہم خدمات سرانجام دئے رہا تھا۔مرتضٰی بیگ اپنے والد کے افغانی جہاد کے کارناموں کے بارے میں لکھی گئی کتابوں کا مطالعہ کرتے ہوئے جوان ہوا تھا۔کبھی کبھار مرتضٰی بیگ اپنے والد کے ساتھ سیف ہاوس بھی جاتا کرتا تھا،جہاں پر رنگین دنیا آباد ہوتی اور اپنے سامنے دنیا کی حسین ترین ناف کوسکڑتے ،لچکتے ،دیکھتا تھا۔اِنہی گناہوں کا حساب چکانے مرتضٰی بیگ افغانستان آکر جہادی کیمپ میں شامل ہوا تھا۔

ابوطالب بھی قلعہ جنگی کا اہم کردار ہے۔جو داغستان کی سرحد کے قریب گاؤں میں رہتا تھا۔ مویشوں کو خشک چارہ ڈالنے اور اِن کا دودھ دوہنے کے سوا انہیں اور کوئی کام نہ ہوتا ۔اِس دوران دودھ،خشک پنیر،اور خشک سبزیوں کا شوربہ اِن کی پسندہ خوراک تھی ۔اِن کو ابتدائی تعلیم اِن کی دادی نفیسہ نے دی ۔اِن کی دادی ہمیشہ اِن کو داغستان کے شاعر رسول حمزہ کی نظم سنایا کرتی جو ایک شرمندگی کے بوجھ تلے دب کر لکھی تھی ۔یہ ماسکو کی سیاست کے اہم دن تھے۔

ہاشم میر ابھی ابھی غنودگی سے واپس آیا تھا۔ہاشم میر انگلستان میں رہتا تھا،گھر میں ہرطرح کا آرام سکون تھا اِن کے ماں باپ ان پڑھ تھے ،لیکن اِن کی والدہ اپنے شوہر کی غلط باتوں کی بھی تائید کرتی تھی۔ اِن کی بہن اپنے شوہر کی روزانہ کی مار پیٹ سے تنگ آکر علیحدہ ہوگئی تھی اور ایک شراب خانے میں نوکری کر لی ۔ جس پر ہاشم میر کے والد نے اُن پر بہن سے ملنے پر پابندی عائد کردی۔اس کے والد کی ساری انرجی ویل فئیر سسٹم سے فائدہ اٹھانے میں صرف ہوئی ۔ماں کو اپاہج قرار دلوا کر اِس کی دیکھ بھال کے لیے حکومتی اور معاشرتی بہبود کی انجمنوں سے باقاعدہ رقم لیتا تھا۔

اللہ بخش ایک بونے کے کہنے پر جہاد میں شامل ہوا۔اِن کے دادا اور نانکے دونوں کا پیشہ مراثی پن تھا۔ گاؤں میں چوہدری کے حقے بھرنا ،جگتیں کر کے اُن کا دل بہلانا ،اور اِس بہانے جھولی پھیلائے رکھنا اُن کا

معمول تھا، اور آخر کار اللہ بخش بغیر بتائے گھر سے نکلا اور اکوڑہ خٹک پہنچ گیا۔

عبدالحمید جان واکر امریکی ماحول کی رنگین فضا کو خیر باد کہہ کر طالبان میں شامل ہوا۔ امریکہ میں اِن کے پاس ایک گھوڑا پونی تھا، اور ایک کار، جس میں اکثر ایک بھرے بدن اور لمبی ٹانگوں والی لڑکی بیٹھی ہوتی۔ لیکن اِس کے بعد وہ ایک تصورِ کامل کے لیے جہاد میں شامل ہو گیا۔

گل شیر ولی کا تعلق دِیر سے تھا۔ جہاں کی سردی ان کو لطف دیا کرتی تھی۔ اِن کے والد ایک نواب کے ہاں ملازم تھا، جہاں وہ نواب کے گھوڑوں اور کتوں کو نہلاتا تھا۔ ان کے گھر میں صابن تک موجود نہ تھی۔ ہمیشہ ننگے پاؤں رہنا اِن کی قسمت میں تھا۔ اِن کی بھوک کو کم کرنے کے لیے ان کی والدہ نے اِن کی بہنوں کو بیچ دیا تھا، تاکہ چند دن آرام سے گزار سکیں۔ پھر ایک دن مسجد میں ایک افغانی کی تقریر سے متاثر ہو کر جہادی کیمپ میں جا پہنچا۔

عبدالوہاب کا تعلق خادمین حرمین شریفین میں سے تھا۔ انہوں نے کیمرج سے علم الانسان کی ڈگری نمایاں پوزیشن میں حاصل کی تھی۔ لیکن اِن کی اس تعلیم نے اِن کو کوئی نصب العین مہیا نہیں کیا۔ دنیانوی علم کو ایک سراب سمجھ کر طالبان میں آ شامل ہوا۔

کرداروں کے تعارف کی تکنیک کی وجہ سے گیارہ ستمبر کے اثرات نے ایک نیا آہنگ پیدا کیا ہے

خس و خاشاک زمانے:

پلاٹ پر 9/11 کے اثرات

مستنصر حسین تارڑ کا دوسرا ناول خس و خاشاک زمانے بھی اس لحاظ سے اہم ناول ہے کہ اس کے پلاٹ اور تکنیک پر بھی گیارہ ستمبر کے اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ اس ناول میں ماضی کے تمام واقعات کو موضوع بنایا گیا ہے۔ یہ ناول اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ اس میں گیارہ ستمبر کے اثرات کو پلاٹ اور نئی تکنیکوں سے ظاہر کیا ہے۔

خس و خاشاک زمانے کے پلاٹ کا پہلا حصہ دنیا پور کے ایک گاؤں کا ہے۔ جہاں پر دیگر برادریوں کے علاوہ جاٹ برادری اپنے رہن سہن اور طور طریقوں کی وجہ سے سب سے نمایاں ہے۔ جاٹ برادری کے مشہور کردار بخت جان اور ان کا دوست لہناں سنگھ ہے۔ بخت جان اپنے بڑے بھائی محمد جان کی

وفات کے بعد ساری زمینوں پر قبضہ کر لیتا ہے ،اور اپنی بھابی کو دھمکی دیتا ہے کہ اگر اُس نے آواز اٹھائی تو وہ اُس کی بیٹیوں کو مہاراجہ رنجیت سنگھ کو بیچ دے گا۔ بخت جان اپنے دوست لہناں سنگھ کی بیوی امرت کور سے بھی شادی کر لیتا ہے۔ بخت جان کو گھوڑی اور عورتوں کا بھی بڑا شوق ہے۔لیکن اب وہ اس حال میں ہے کہ اپنی بھتیجی نور بیگم کے قریب المرگ مرغ کو کھانے کے لیے ترّ لے منتیں کر رہا ہے۔وہ پہلے بھی اس کی مردہ مرغیوں کو کوڑے کے ڈھیر سے اٹھا کر کھا چکا ہے۔

ناول کے پلاٹ کے دوسرے حصہ میں دوسری نسل کے چند کردار لاہور جاتے ہیں تا کہ نوکر ہو کر اچھی زندگی بسر کی جائے۔ان کرداروں میں امیر بخش ،اکبر جہان ،اور سانسی قابلِ ذکر ہیں خس و خاشاک زمانے کے حوالے سے ڈاکٹر ممتاز احمد اپنی کتاب اردو ناول کے چند اہم زاویے :اضافوں کے ساتھ، میں بیان کرتے ہیں۔

> ناول کوٹ ستارہ، دنیا پور، اور نت کلاں کے اہم کرداروں بخت جان لہناں سنگھ، امرت کور ،سرو سانسی، امیر بخش، مائلو، سوہن سنگھ ،گوبند نونہال سنگھ ،وغیرہ کے حوالے سے بیسویں صدی کے پورے سماجی ،معاشرتی ،تہذیبی ،تاریخی، اور کسی حد تک سیاسی منظر نامے کا پر شکوہ اسلوب میں احاطہ کرتا ہے۔اس ناول کو دیگر قابلِ ذکر ناولوں کے اثاثے کے مقابلے رکھیں تو کوئی اضافہ نہیں تاہم موضوع اور ماجرے کی فنی و تکنیکی بُنت کے اعتبار سے نیز ایک خاص نقطہ نظر کے وسیلے ہمیں یہ احساس دلاتا ہے کہ فکشن کی دنیا میں اکیسویں صدی کے پہلے عشرے کے اختتام پر اِس تحریر کی اشد ضرورت تھی ،خاص طور پر جبکہ انسان کی زندگی تیزی سے زیر و زبر ہو رہی ہے، اور برصغیر کی ثقافتی اکائیوں کی بیرونی اثرات سے آلودگی اور اندرونی زندگی میں گہری ٹوٹ پھوٹ کا دائرہ مکمل رہنے کے قریب ہو تب ہم اس راکھ سے ایک نئے آدم کی تلاش کرتے نظر آتے ہیں....(۲۳)

خس و خاشاک زمانے کے پلاٹ میں ہماری ماضی کی سیاست کے تمام کردار اور واقعات کا بھی تذکرہ موجود ہے۔ماضی کا یہ رشتہ آگے چل کر افغانستان ،عراق پر امریکی حملے تک جا پہنچتا ہے۔اس سے پلاٹ

میں جدت کا عنصر بھی شامل ہو جاتا ہے۔جس کی وجہ سے ناول کا کینوس وسیع تر ہو جاتا ہے۔ماضی کے رشتہ کے ساتھ اکیسویں صدی کے واقعات و حادثات کے تانے بانے کو مشرف عالم ذوقی سلسلہ روز و شب میں بیان کرتے ہیں:

> سارتر کا ایک کردار اپنی کہانی دیوار میں ایک سوراخ کے بہانے موہوم سی روشنی کا طلبگار تھا۔صدیوں پر محیط ناول خس وخشاک زمانے میں تارڑ آزادی اور غلام فضا دونوں ایام میں اسی روشنی کو تلاش کرتے رہے۔وہ بونے تو نظر آئے جو کنویں کی گہرائی سے نکل کر بخت کو تقسیم کا خوف دیکھا رہے تھے،لیکن ایک تقسیم کے بعد تقسیم کا سلسلہ بند کہاں ہوا۔ہند و پاک کے ڈراونے خواب سے نکل کر یہ داستان سقوط بنگلہ دیش،ایران ،افغانستان ،عراق کے پس منظر میں جب اپنے ٹوٹے خوابوں کی کرچیاں دکھاتی ہے ،تو ارتقاء سائنس،اور تیزی سے بھاگتی نئی دنیا کا خوف ذہن و دل پر طاری ہوتا ہے۔(۲۴)

ناول کے پلاٹ کا تیسرا حصہ اور تیسری نسل سے تعلق رکھنے والا کردار انعام اللہ کا ہے۔جو اپنے ماضی سے لیکر گیارہ ستمبر کے بعد تک کے زمانے کے ساتھ زندہ رہتا ہے۔اس سے پچھلی دونسلیں دنیا میں آکر اپنا کردار ادا کر کے رخصت ہو چکیں ہیں۔انعام اللہ کی پیدائش ناجائز تھی۔وہ صبح فجر کی نماز کے وقت گرو مانگٹ کی بوسیدہ مسجد کی سیڑھیوں میں پڑا ملا۔نمازی اس کو ایک نعت خواں کے کہنے پر سنگسار کرنے کے لیے پتھر تلاش کرتے ہیں تو اسی موقع پر حاجتِ رفع سے فارغ ہو کر سانسی معاملے کی نزاکت کو سمجھ جاتا ہے اور یہ کہہ کر کہ یہ حرامی نہیں میرا بیٹا ہے انعام اللہ کو سنگسار ہونے سے بچا لیتا ہے۔یہاں پر ناول کا پلاٹ انتہائی دلچسپ مرحلے میں داخل ہو جاتا ہے۔

بڑا ہو کر انعام اللہ تمام رنگ ونسل،عقیدے،اور مذہب سے آزاد انسان ہوتا ہے۔وہ تقسیم کے خونی کھیل میں بھی شامل نہیں ہونا چاہتا تھا۔مگر مجبوری نے انعام اللہ کو تقسیم کے گھناونے کھیل شامل کر لیا۔اس کے ہاتھوں میں بھی اب تھری ناٹ تھری ہے۔تقسیم کا آگ جیسا سمندر،مت مارونیئوا کے تیر، اور 71,65 کی جنگوں جیسے حالات کے بھی عینی شاہد ہیں۔انعام اللہ کے پرورش امیر بخش نے کی تھی ،اور امیر بخش نے اپنے بیٹا روشن

سے زیادہ محبت انعام اللہ کو دی ۔دونوں جوان ہو کر صحافت کے میدان میں آ گئے ۔روشن اور انعام اللہ دونوں ایک ہی سکّے کے دو رخ تھے اُن کے نظریات پر اُن کے والد امیر بخش کا گہرا اثر تھا ۔اِن دونوں کے حوالے سے بیان کیا جاتا ہے:

> جہاں اُس پر تقدس مذہبی تعصب کی تاریخ انعام اللہ کی پشت پر کھدی ہوئی تھی وہاں روشن کے نصیب میں جو جیل کے دن اور راتیں آئیں تھیں اُنہوں نے اُسے اُسی طور زندگی کی بے معنویت اور نا انصافی سے آگاہ کر دیا تھا، جیسے پچھلے زمانوں میں خوشی محمد تھانیدار کے کتوں کے دانتوں نے اُس کے باپ کو معاشرے کی کج روی اور زور آوروں کی منافقت سے روشناس کر دیا تھا (۲۵)

پلاٹ کے اِس حصہ میں فلیش بیک کی تکنیک کا استعمال کیا گیا ہے ۔کیونکہ انعام اللہ اور روشن کو پہلے نیو یارک کی سڑکوں پر مزدوری کرتے ہوئے بتایا گیا ہے اور اس کے بعد اِن کا تذکرہ ضیاء الحق کے دور کی باقیات کو ظاہر کرتے ہیں ۔اِس کے بعد انعام اللہ کو ایک اختلافی کالم لکھنے پر موچی دروازے کی تاریخی جلسہ گاہ میں لکڑی کے تختوں پر باندھ کر کوڑے مارے جاتے ہیں ۔پلاٹ کے اِسی حصہ میں انعام اللہ ایک انگریزی ناول آٹو بائیو گرافی آف اے باسٹڈ لکھتا ہے ۔جس کے خلاف مذہبی مظاہرے شروع ہو جاتے ہیں اور یوں انعام اللہ پاکستان کی فضاؤں سے نکل کر نیو یارک کی فضاؤں میں سانس لینے لگتا ہے ۔اس حوالے سے مستنصر حسین تارڑ لکھتے ہیں

> جان ایف کینیڈی انٹرنیشنل ایئر پورٹ کے ماتھے میں نصب شیشے کے شفاف اُن دروازوں کے پار جو نیو یارک پر کھلتے تھے ایک اجنبی شہر خاموشاں تیزی سے حرکت کرتا دکھائی دیتا تھا ۔جب کوئی مسافر اپنے سامان کی ٹرالی دھکیلتا اُن کے قریب ہوتا تو وہ مودب غلاموں کی مانند اُلٹے قدموں وا ہو جاتے، اُن کے کھلنے سے باہر کا شہر خاموشاں ایک شہر شور میں بدل کر ایئر پورٹ کے اندر داخل ہو کر گونجنے لگتا ۔وہ آخری مسافر تھا جو امیگریشن کائنٹر اور کسٹم سے فارغ ہو کر اپنے سیاہ بیگ میں دفن آٹو بائیو گرافی آف اے باسٹرڈ کی جلدوں کا بوجھ محسوس کرتے ابھی تک ایک سہے

ہوئے بچے کی مانند چمکیلے فرش پر بے حس و حرکت کھڑا تھا....(۲۶)

گیارہ ستمبر کا سانحہ عام انسانوں کی ٹریجڈی کا دن تھا۔اِس لحاظ سے گیارہ ستمبر کے اندوہناک واقعہ نے خس و خاشاک زمانے کے پلاٹ کو متاثر کیا ہے۔ناول کا آغاز تو 1930ء سے ہوتا ہے،لیکن اِس کے واقعات کی ترتیب میں گیارہ ستمبر کا سانحہ بھی شامل ہو جاتا ہے۔گیارہ ستمبر کے سانحہ کی تصویر کشی ان الفاظ میں کی گئی ہے

> جب اُس کے اندر ایک ملفوف سی گونج داخل ہوئی....ایسی کہ جیسے دل بیٹھتا ہو،جیسے بہت دور کی ایک کائنات منہدم ہو رہی ہو ...صور پھونکا جا رہا ہو وہ وقت آ گیا ہو جب ۔بے انت زمانوں کے بعد جب سے یہ کائنات تخلیق ہوئی ہے تب سے اس مٹی میں جتنے بھی بے انت ان گنت لوگ دفن ہوئے اُن سب کی قبریں شگاف ہونے لگیں...مٹی میں مٹی ہو چکی ہڈیاں وجود میں آ کر جڑنے لگیں اور وہ سب زندہ ہونے لگیں جو ازلوں سے فنا کی تاریکیوں میں دفن تھے ...جیسے یومِ حساب آ گیا ہو۔(۲۷)

ناول کے اس پیرائے سے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ خس و خاشاک زمانے کے پلاٹ پر گیارہ ستمبر کے کتنے گہرے اثرات مرتب ہوئے ہیں ۔اس وجہ سے پلاٹ میں جدت طرازی کا عنصر بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ انعام اللہ جو اپنی سرزمین میں مذہبی تنگ نظری سے تنگ آ کر مریکی سرزمین پر جا بسا تھا اُس کو بھی اِس واقعہ کا شدید دکھ تھا۔

گیارہ ستمبر کے بعد دنیا بالکل بدل گئی اِس سانحہ کے اثرات بہت گہرے مرتب ہوئے۔امریکی لوگوں میں مسلمانوں کے خلاف نفرت انگیز رویے پیدا ہو گئے ،مذہبی تعصب کی لہر پورے امریکہ میں پیدا ہو گئی ۔لوگ ڈرتے ڈرتے مساجد جاتے ،لوگوں نے اپنے نام بھی تبدیل کر لیے۔بہت سے لوگوں کو حراست میں لے لیا گیا۔اس سانحہ کے بعد امریکہ میں انتقام کی آگ پھیلنی شروع ہو گئی ۔انتقام کی اِس آگ میں امریکہ نے دھمکی کے زور پر تیسری دنیا کے کمزور ممالک کو بھی اپنے ساتھ شامل کر لیا۔اور مزید کہا کہ اگر ہمارا ساتھ نہ دیا تو ہم آپ کو اپنے مخالف سمجھیں گے۔پاکستان کے اُس وقت کے فوجی حکمران جنرل پرویز مشرف کو فون پر دھمکی دی ۔ جس کے بارے میں پرویز مشرف اپنی کتاب سب سے پہلے پاکستان میں بیان کرتے ہیں:

> اگلی صبح جب میں گورنر ہاوس میں ایک میٹنگ کی صدارت کر رہا تھا تو میرے ملٹری سیکرٹری نے آکر کہا کہ امریکی وزیرِ خارجہ جنرل کولن پاول Colin (Powell) ٹیلی فون پر ہیں۔ میں نے جواب دیا کہ میں انہیں بعد میں ٹیلی فون کر لوں گا، لیکن ملٹری سیکرٹری نے اصرار کیا کہ میں میٹنگ چھوڑ کر باہر آوں اور ٹیلی فون پر بات کروں۔ پاول نے صاف صاف کہا کہ یا تو آپ ہمارے ساتھ ہیں یا ہمارے خلاف۔ میں نے اُسے ایک کھلا مطالبہ سمجھا.....(۲۸)

یہ واقعی ہی ایک کھلا مطالبہ تھا۔ یہ سانحہ پاکستان سے دور امریکی سر زمین پر ہوااور کوئی بھی پاکستانی شہری اِس میں ملوث نہ تھا، لیکن اِس سب کے باوجود گیارہ ستمبر کے سانحہ کے اثرات سب سے زیادہ پاکستان پر مرتب ہوئے۔ یہ کھلی دھمکی اور مطالبہ بھی خس و خاشاك زمانے کے پلاٹ کا حصہ ہے۔ جو گیارہ ستمبر کے اثرات کو ظاہر کرتے ہیں۔ اِس حوالے سے مستنصر حسین تارڑ لکھتے ہیں

> نصف شب کی قربت میں جب ایک کمانڈو جنرل جس کی جرات اور شجاعت کا کچھ حساب نہ تھا ہڑبڑا کر اپنے بستر سے اٹھتا ہے...اور فون اٹھا کر اپنے شب خوابی کے لباس کے پاجامے کا ازار بند تھامتا اٹھتا ہے تو اٹینشن ہو جاتا ہے ...یس سر... یا تو آپ ہمارے ساتھ ہیں یا نہیں ہیں ...اگر نہیں تو.....ووئی وِل بومب یوٹو سٹون ایج۔ (۲۹)

اِس سے یہ حقیقت آشکار ہو جاتی ہے کہ گیارہ ستمبر کے سانحہ کے بعد کس طرح دنیا یکسر تبدیل ہوگئی۔ خس و خاشاك زمانے کے پلاٹ میں طیاروں کا عمارتوں سے ٹکرانے سے لیکر امریکہ کا افغانستان اور عراق پر حملے تک گیارہ ستمبر کے تمام اثرات موجود ہیں۔ انعام اللہ جو ہر قسم کے تعصب سے پاک انسان تھا، کو بھی نفرت کا سامنا کرنا پڑا اُس کے لیے یہ دن کربلا سے کم نہ تھا۔ انعام اللہ کو اِن میناروں کے ڈھے جانے سے بہت رنج ہوا تھا۔ ویسے بھی اس کھنڈر میں اُس کے ہم مذہب بھی تو دفن ہو گئے تھے۔ اِس لیے وہ ان سب معصوم لوگوں کی یاد میں موم بتی روشن کرنے جاتا ہے۔ جہاں لوگ اُس کو نفرت کی آنکھ سے دیکھتے ہیں۔ وہاں پر موجود لوگ انعام اللہ کے بارے میں ان خیالات کا اظہار کرتے ہیں

> وہ جو اِن کھنڈروں کی زیارت کرنے آئے تھے، اُن کی نظریں اُس پر ٹھہرتی

> تھیں.... بہت دیر ٹھہری رہتی تھیں کہ یہ...اُنہی کا ہم شکل اور ہم رنگت ... یہاں یہ دیکھنے کے لیے آیا ہے کہ اِس کا مشن کس حد تک کامیاب رہا ہے۔جیسے ایک مجرم ہمیشہ وہاں لوٹتا ہے ، جہاں اُس نے جرم کا ارتکاب کیا ہوا اور اب اپنے جرم کو چھپانے کی خاطر ایک موم بتی روشن کر کے ہمیں بے وقوف بنا رہا ہے۔(۳۰)

خس و خاشاک زمانے اپنے پلاٹ کی بناء پر ایک نہایت عمدہ ناول ہے۔ جو اس کو دوسروں ناولوں سے ممتاز کرتا ہے۔ کیونکہ اس کے پلاٹ میں گیارہ ستمبر کے اثرات کی وجہ سے ایک نیا پن کے ہونے کا احساس ہوتا ہے۔ مستنصر حسین تارڑ نے خس و خاشاک زمانے کے پلاٹ کو کچھ ایسے تانے بانے سے تیار کیا ہے کہ یہ اپنی نوعیت کا منفرد پلاٹ بن جاتا ہے۔ اس کے کردار اور واقعات ایک منحنی دائرے میں سفر کرتے ہیں اور ایک نیا تاثر پیدا ہوتا ہے۔ انسانوں پر گزرے ہوئے واقعات کے اثرات اور عام انسانوں کی ٹریجڈی کی وجہ سے خس و خاشاک زمانے کا پلاٹ اپنی نوعیت کا سب سے الگ پلاٹ ہے۔ انہی اوصاف کی بناء پر جریدہ چہار سُو میں بیان کیا گیا ہے:

> اِس کا پلاٹ اتنا پیچیدہ ہے جتنا راکھ کا ہے۔جس کے بارے میں ایک مبصر کی رائے ہے کہ اِس ناول کا بیانیہ سادہ خطِ مستقیم پر حرکت کرنے کی بجائے دائروں میں حرکت پذیر ہے۔ ایسے دائرے جو حجم اور معنی کے اعتبار سے پھیلتے رہتے ہیں ۔حتیٰ کہ مصنف اِس مقصد کے لیے کسی اور دائرے کا انتخاب کرتا ہے۔ یہی دائروی خط کہانی بنیادی حقیقت ہے ، جسے مصنف ایک ماہر مداری کی طرح یوں گھماتا جاتا ہے کہ کوئی بھی دائرہ اپنی مقررہ جگہ سے نہیں باہر جاتا۔(۳۱)

خس و خاشاک زمانے کے پلاٹ پر گیارہ ستمبر کے تمام اثرات کو اُسی ترتیب سے بیان کیا ہے جس ترتیب سے اس سانحہ کے اثرات مرتب ہوتے رہے۔ عام مسلمانوں کو کس قسم کے مسائل کا سامنا کرنا پڑا، یورپی لوگوں کا غم وغصہ کا اظہار، تمام مسلمانوں کو اس سانحہ کا مجرم قرار دینا، جیسے تمام مسلمان اُسامہ بن لادن کے ساتھی ہوں۔ اس کے بعد امریکہ نے افغانستان پر باقاعدہ حملہ کردیا۔ افغانستان پر امریکی حملے کے اثرات کو ناول میں اس طرح بیان کیا گیا ہے

ہمیشہ کی مانند دریائے ہڈسن کے پانیوں پر بادبانی کشتیاں آہستگی اور امن سے رواں نظر آتی تھیں لیکن اُن پانیوں کی تہہ میں نفرت اور انتقام کے اژدھے پھنکارتے تھے اور اِس پھنکار کو صرف اُن کے کان سن سکتے تھے جن کی رنگت مشرقی تھی، جن کی آنکھوں میں سیاہی تھی اور جو موزلم کہلاتے تھے۔ آنے والوں دنوں میں جو کچھ ظہور پذیر ہونا تھا وہ سنٹرل پارک میں اُترتی خزاں کے ہر پتے پر درج تھا، پڑھا جا سکتا تھا۔ عقیدے نے اپنی سینکڑوں برس کی غفلت، بے حسی، اور نالائقی کا خمیازہ بھگتنا تھا اور ٹیکنالوجی کے کفر کے آگے سجدہ ریز ہو کر شکست سے دوچار ہونا تھا ...سینکڑوں بچوں نے اپنی ماں کی گودھ میں ہلاک ہوجانا تھا...اگر اُن بچوں کے بس میں ہوتا تو وہ اُس عقیدے کے ماں باپ کے گھر ہرگز پیدا نہ ہوتے جس نے پچھلے پانچ سو برس سے ایک نیل کٹر بھی ایجاد نہ کیا تھا اور محض آسمانی امداد کے طلبگار اپنے رب کے آگے سجدہ کرتے گڑگڑاتے ... اے رب اِس کفر کو نیست و نابود کردے کی دعائیں مانگتے رہے تھے...لیکن اُدھر سے آسمانوں سے غیب سے فرستوں نے کہاں اُترنا تھا۔ (۳۲)

افغانستان میں ہر جگہ گہرے گڑھے تھے جو صرف ڈیزی کٹر جیسے کیمیائی بم ہی بنا سکتے تھے۔ لاشوں کی شناخت ختم ہو چکی تھی، موت نے اُن کو جو مختلف رنگ و نسل کے تھے، سب کو ایک سیاہ رنگ کی وحدت عطا کردی، تا نکہ شناخت کا مسئلہ نہ رہے اور اس طرح وہ پہچانے نہ جا سکیں۔ بی 52 کا عذاب الگ تھا جو انسانی لاشوں کے پرخچے اڑا کر دھوں اور مٹی میں غائب کرنے کا کام سرانجام دے رہے تھے۔ لوگوں کے جسموں کے اندر بموں کے ٹکڑے آرام کرتے تھے، جو زندہ بچ جاتے وہ ایسے پھڑ پھڑاتے جیسے کسی فلم کا کوئی نئے انداز کا حیرت ناک ناچ دکھایا جارہا ہو۔ گیارہ ستمبر کے یہ تمام اثرات خس و خاشاک زمانے کے پلاٹ پر مرتب ہوئے ہیں۔ اِنہی اثرات کو قلعہ جنگی میں یوں بیان کیا ہے:

لاشوں کا ایک بے انت صحرا تھا۔ جیسے ایک وسیع کھیت میں جگہ جگہ مینڈھیں اُبھرتی ہوئی ہوں۔ اُن میں سے بیشتر اور وہ سینکروں کی تعداد میں تھیں ادھڑی ہوئی، کٹی

پھٹی حالت میں پڑی تھیں جیسے کسی بے رحم سرجن نے اُن کا پوسٹ مارٹم کر کے اُنہیں پھینک دیا ہو۔(۳۳)

خس و خاشاک زمانے کے پلاٹ پر گیارہ ستمبر کا جو سب سے نمایاں اثر ہے وہ خس و خاشاک زمانے کے پلاٹ پر افغانستان پر امریکی حملہ ہے۔خس و خاشاک زمانے کے پلاٹ میں یہ بھی دکھایا گیا ہے کہ امریکی حملے کس انداز سے کیے جاتے تھے،افغانیوں کے لیے کہاں سے موت کے پیغام آتے تھے۔افغانیوں کو اُوپر سے کھانا آنے کی بجائے بڑے بڑے کروز میزائل آتے جو اُن کو موت کے بدترین ذائقے سے ہمکنار کرتے۔خس و خاشاک زمانے کے پلاٹ میں اِن کا احاطہ اِن الفاظ میں کیا گیا ہے

بیٹل شِپ کا رل وِنسن اور انٹر پرائز جو جانے کن دور دراز کے سمندروں میں تیرتے تھے اُن کے عرشے سے مسلسل ٹاماہاک کروز میزائل جنم لے کر اُن سمندروں کے پار افغانستان کے ریگ زاروں اور آبادیوں پر گرتے اُنہیں بھسم کرتے تھے۔اس ملک کو خشکی میں گھِرا ہونے کا چنداں فائدہ نہ ہوا تھا کہ سمندروں سے اجل کے پیام آتے چلے جاتے تھے۔بحرِ ہند کے جزیرے ڈیگو گارسیا سے بلند ہونے والے ہوائی جہازوں کے پَرے کے پَرے اُڑان کرتے بے خطر افغانستان کے آسمانوں پر راج کرنے چلے آرہے تھے،اُنہیں گرانے کے لیے اُس کی زمینوں پر نہ کوئی سِٹنگر میزائل تھے اور نہ کوئی قابلِ ذکر اینٹی ایئر کرافٹ گنیں،وہ گویا سنٹرل پارک میں سیر کرنے چلے آرہے تھے،اپنا مہلک بوجھ گراتے،واپس جاتے اور پھر سے بوجھل ہو کر لوٹ آتے یہ سب کچھ وہ محض اپنی انتقامی تشفی کے لیے کر رہے تھے ورنہ اُن کے نیچے زمین پر بستیوں کے کھنڈروں کے سوا کچھ نہ تھا،جنہیں وہ مزید کھنڈر کر رہے تھے۔(۳۴)

غور کیا جائے تو یہ بات عیاں ہے کہ افغانستان پر حملہ کرنے کا کوئی جواز نہ تھا،اس میں بہت سے وہ لوگ بھی مارے گئے جن کا کسی قسم کا کوئی قصور نہ تھا۔صرف مشرقی رنگت والے امریکیوں کو دہشت گرد نظر آتے،جس کا کوئی جواز نہ تھا۔خالد جاوید اپنی کتاب کہانی،موت،اور آخری بدیسی زبان،میں

بیان کرتے ہیں:

> گیارہ ستمبر کو جو کچھ ہوا وہ پورے طور سے لایعنی ہے (Absurd) اور اس کی کوئی ضرورت نہ تھی ۔یہ واقعہ دنیا اور اِس کے باہمی رشتوں میں زائد(Redundant) بھی ہے ۔مگر خوفناک بات یہ ہے کہ امریکہ نے انتقاماً افغانستان میں جو کچھ کیا وہ بھی اس لایعنیت کا اہم عنصر ہے ۔اور اس کی بھی کوئی ضرورت نہ تھی ۔ہم یہ بھی صاف دیکھ رہے ہیں کہ امریکہ کے ضمیر پر بھی کسی قسم کا کوئی بوجھ نہیں ہے۔اس کے جمہوری نظامِ اعصاب میں ریڑھ کی ہڈی نہیں ہے۔(۳۵)

گیارہ ستمبر کے اثرات نے لوگوں کے سوچ کے رویوں کو بھی تبدیل کر دیا۔اس کی عکاسی بھی خس و خاشاک زمانے میں بھر پور انداز میں کی گئی ہے ۔انعام اللہ جو کہ مذہبی تنگ نظری سے تنگ آ کر امریکہ میں ٹیکسی ڈرائیور ہو جاتا ہے لیکن انعام اللہ کے لیے بھی گیارہ ستمبر کے بعد دنیا وہ نہیں رہی تھی جو پہلے تھی ۔امریکیوں کے ہاتھوں اُس کی بے عزتی ہونا اس کی بات کی دلیل ہے ۔کوئی گورا اُس کی ٹیکسی میں سوار نہ ہوتا تھا چونکہ اِن گوروں کے لیے انعام اللہ جیسا شخص بھی جو ہر قسم کے مذہب سے آزاد شخص ،جس کی شخصیت خود ان کے لکھے ہوئے ناول آٹو بائیوگرافی آف اے باسٹرڈ سے بھی بخوبی واضح ہو جاتی ہے کو بھی مسلم دہشت گرد قرار دیا گیا۔ اور یہ واقعہ ہر دفعہ دوہرایا جاتا ،اتنی دفعہ ایسا ہوا کہ وہ شک کرنے لگا کہ ایک ہی گورا ہے جو بھیس بدل بدل کر مجھے بے عزت کرتا ہے ۔اس حوالے سے انعام اللہ محسوس کرتا ہے:

> اُسے شک ہونے لگا کہ ہر دو چار روز کے بعد جو گورا مسافر آتا ہے وہ دراصل ایک ہی ہے جو بھیس بدل کر اُسے بار بار بے عزت کرنے کے لیے ،زچ کرنے کے لیے آ جاتا ہے ...اور یہ حقیقت تھی شک نہ تھا۔وہ واقع ہی صرف ایک مسافر تھا جو کہیں نہ کہیں اُس کا منتظر رہتا ۔اُسے لعن طعن کرنے کی خاطر ،بے توقیر کرنے کے لیے ----.(۳۶)

خس و خاشاک زمانے پر گیارہ ستمبر کا ایک اور اندوہناک اثر عراق پر امریکی حملہ ہے۔ افغانستان کے مقابلے میں زیادہ نقصان عراق کا ہوا۔عراق کے نہ صرف بڑے بڑے باغات جل کر راکھ ہو گئے

تھے، بلکہ اب تو پورا پورا شہر جو شہزاد اور الف لیلےٰ کا شہر تھا، کھنڈر بنا دیا تھا۔ ہلاکو کی نسبت امریکہ زیادہ وحشیانہ انداز سے بغداد کو تباہ کر رہا تھا، شہر میں اسلامی کتابوں سے آنچ سُلگ رہی تھی، باغات کی تمام چڑیاں مر چکی تھیں۔ بابل و نینوا کے شہر کو راکھ بنا دیا تھا۔ افسانہ نگاروں میں سے انور زاہدی کا افسانہ ''یہ جنگل کٹنے والا ہے'' میں بغداد کی تباہی کو ہی بیان کیا ہے۔ لیکن خس و خاشاک زمانے میں بغداد کی تباہی کو اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے

> سکرین کی سیاہی میں آسمان سے نازل ہوتی کروز میزائلیں اور ڈیزی کٹر دکھائی نہیں دیتے ... یوں لگتا ہے کہ وہ تو اُس کے گلی کوچوں اور شاہراہوں کی بنیاد میں مدتوں سے مدفون تھے اور اب کسی سامری کے انتقام کے سحر سے وہ یکدم پھٹنے لگے ہیں۔ بابل کے مینار جو ابھی تک سر بلند اور قائم تھے، اوندھے ہو کر منہدم ہو رہے تھے، اُس کے معلق باغوں کے شجر جڑ سے اکھڑ رہے ہیں اور اُن کے پتے آسمان سے برستی زہریلی آگ کی تاب نہ لا کر راکھ ہو رہے ہیں، بے شک یہ باغ ایک بلندی پر معلق تھے، لیکن اُن سے بھی کہیں بلندی پر وہ عفریت حرکت میں تھے جو فور ٹریس، بی باون لانسر کہلاتے تھے اور اُن میں سے ایسی خاموش آگ برستی تھی جو آتشِ غرور سے کہیں بڑھ کر غضب ناک اور دیوتاؤں کو بھی بھسم کر دینے والی تھی۔ اُن متحرک آسمانی عفرتوں میں جو سوار تھے، اُنہیں کچھ خبر نہ تھی کہ اُن کے نیچے اُن کی میزائلوں اور بموں کی زرد میں شہر بابل کے مینار اور معلق باغ ہیں کہ اگر اُن کے دو جڑواں مینار ڈھا دیئے گئے تھے تو اُن کے سامنے یہ مینار کیا حثیت رکھتے ہیں اور کیا جانیں کہ یہ معلق باغ کیا ہیں، وہ تو صرف اپنے سنٹرل پارک کو جانتے تھے۔ (۳۷)

گیارہ ستمبر کے بعد کی تنگ نظری نے انعام اللہ کو کو بھی امریکہ میں رہنے نہ دیا تھا۔ اُن کا اب امریکہ میں رہنا آسان نہ تھا۔ وہ روزانہ اپنی بے عزتی برداشت کرنے کا عادی نہ ہو سکا تھا۔ اجتمائی بے عزتی نے انعام اللہ کو امریکہ سے بھی ہجرت کرنے پر مجبور کر دیا۔ اُن کا ہجرت کا یہ سفر گورو مانگٹ کی مسجد سے شروع ہوا تھا، اب تیسری مرتبہ امریکہ سے کینیڈا کی طرف ہجرت کا سفر تھا۔ آخر کار انعام اللہ آسانی سے سرحد پار کر کے کینیڈا میں

داخل ہو جاتا ہے، جہاں اُس کی ملاقات سانسی کے بیٹے سے ہوتی ہے۔اس کے بعد انعام اللہ جو پہلے ایک ناول نگار تھا، اب ایک دکاندار بھی بن گیا تھا اور کینیڈا میں کھلونوں کی دکان ''گفٹ فار بی از'' کھول لی۔

کینیڈا میں آخر انعام اللہ کی ملاقات شباہت سے ہوتی ہے جو اُس کی زندگی کو نئی ڈگر پر لاتی ہے۔ خس و خاشاک زمانے کے پلاٹ کی یہ بھی خوبی ہے کہ اس کے کردار غیر ملک میں آباد ہوتے ہیں۔جو کہ زمانے کی تبدیلی کو ظاہر کرتے ہیں۔لیکن انعام اللہ کینیڈا آ کر بھی اپنی اجتمائی بے عزتی کو نہ بھول سکا اور اس کا حساب چکانے کے لیے کئی نئے پروگرام بنا چکا تھا، مگر شباہت آڑے آجاتی جو ایک بنکر ہونے کے ساتھ صاحب بصیرت شخصیت بھی تھی۔سانسی کی بیٹی اور موجو کی بیٹی شباہت اپنی بصیرت کے بل بوتے پر اسے اس جہاں سے دور ایک اور نئے جہاں میں لے جانا چاہتی تھی۔اس حوالے سے شباہت کا کردار بہت جاندار ہے۔لیکن انعام اللہ کو وہ امریکی پائلٹ یاد آتے جو وکٹری کا نشان بنا کر چہرے پر مسکراہٹ کے ساتھ مخصوص گھروں کو نشانہ بنا کر ایک آگ کے گڑھے میں دفن کر دیتے اور یہی پائلٹ پھر عراق پہنچ گئے وہاں کے باغات کو تباہ کرنے کا انداز وہی پرانا تھا۔

یہ خیالات انعام اللہ کو خودکشی پر مائل کرتے۔شاید یہی طریقہ اجتمائی بے عزتی کا ازالہ کر سکے لیکن شباہت ان کو اِن کو ایک نئے سفر کی راہ متعین کرنے کے لیے کہتی، کہ اگر اُس نے خودکشی کی تو ناول سپیروز آر ڈیڈ کون لکھے گا، کون اس وحشیانہ پن کو ظاہر کرے گا، اگر وہ اپنی بے عزتی کا بدلہ لینا چاہتا ہے تو یہ ناول مکمل کرے، شباہت کی بصیرت بڑی فکر انگیز ہے۔اس لیے وہ انعام اللہ سے کہتی ہے وہ سانسی کی آخری نسل ہے، اگر وہ چاہے تو ہم ایک ایسا جہاں آباد کر سکتے ہیں جہاں امن ہو، انسانیت ہو، کسی قسم کا کوئی تعصب نہ ہو، جہاں روشنی ہو، بارود کی بُو نہ ہو، اور ایک ایسا آدم تخلیق کر سکتے ہیں جو کسی قسم کے دھماکوں سے آشنا نہ ہو، اگر تم چاہو۔ اس پر انعام اللہ کا ردِعمل یوں ظاہر ہوتا ہے

> انعام اللہ کی ....شباہت کے بے لباس پیٹ کی جانب بڑھتی ہتھیلی یہ جانتی تھی کہ جب وہ اس پر آرام کرے گی تو اس کے ماس کے اندر سے ایک دھک دھک کرتی دستک دینے لگے گی۔(۳۸)

مستنصر حسین تارڑ کا ناول خس و خاشاک زمانے اس لحاظ سے بہت قابلِ ذکر ناول ہے کہ اس

کے پلاٹ میں ماضی سے لیکر اکیسویں صدی تک کی تمام تاریخ کو دلچسپ بیانیہ میں پیش کیا ہے۔ناول کے پلاٹ میں سانحہ گیارہ ستمبر کے تمام اثرات خصوصاً افغانستان اور عراق کی تباہی کی تاریخ کو محفوظ کیا گیا ہے،ناول کا پلاٹ گیارہ ستمبر کے اثرات کی سچی گواہی ہے۔

تکنیک پر 9/11 کے اثرات

خس و خاشاک زمانے کے پلاٹ کے پر گیارہ ستمبر کے اثرات کے علاوہ اس کی تکنیک پر بھی گیارہ ستمبر کے اثرات نمایاں ہیں۔ان تکنیک کی بناء پر خس و خاشاک زمانے ایک نئی طرز کا ناول ہے جس نے ناول نگاری کے نئے دریچے اور اُفق دکھائے ہیں۔آگ کا دریا نے ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں کے لوگوں کے ذہنوں پر ایک طویل عرصہ تک حکومت کی ہے،جس کے اثرات 2010 میں شائع ہونے والے ناول خس و خاشاک زمانے کی وجہ سے زائل ہوئے ہیں۔اور اب خس و خاشاک زمانے طویل عرصہ تک دلوں پر راج کرے گا،جب تک کوئی اس ناول سے اچھا دوسرا ناول منظرِ عام پر نہیں آجاتا۔ایک نئے اور تکنیک کے استعمال کی طرز پر اس ناول کا تعارف ڈاکٹر محمد سفیر اعوان ان الفاظ میں کراتے ہیں

> Khas-o-Khashak Zamanay is a novel Containing Multiple and wide range of Character Stories within Stories Questioning of colonial and new colonial Working in Contempary Pakistani and American Society.The Narrative of khas-o-khashak Zamanay Is more complex Than Raakh .It is an extension of the novel Raakh in term of thematic Puliplicity and use of narrative Techniques. This novel Contains two perrallel layers of events.One goes with the surface level of the text,easily recognizable through a number of tangible metaphors, and the other one in that falls in the category of new metaphorical system of symbols associated with the past and historical events,for understanding these ideological and metaphorical construction,a reader has to have historical and political consciousness of the social constructs(39)

خس و خاشاک زمانے کی پہلی تکنیک علامت نگاری ہے اور اس علامت نگاری پر گیارہ ستمبر کے نمایاں اثرات ہیں۔انعام اللہ شباہت کے ساتھ ایک نیاء جہان آباد کرنے کے لیے ایک طویل سفر اختیار کرتا

ہے ۔لیکن جہاں پر اُن کا سفر اختتام کو پہنچتا ہے وہاں سے کھڑا ہوکر انعام اللہ امریکی برجیاں دیکھتا ہے ،جن کو انعام اللہ پاش پاش کر کے اپنی عزت نفس کے مجروح ہونے کا بدلہ چاہتا ہے ۔ناول میں یہ برجیاں امریکی استحصالی نظام کی علامتیں ہیں ۔ان برجیوں کے حوالے سے انعام اللہ سوچتا ہے:

> وہ برجیاں گویا ایک تختہ دار تھیں جن کی جانب حلاج اپنی من مرضی سے بڑھتا تھا یہ جاننے کے باوجود کہ ان پر مصلوب کر دیا جائے گا۔۔۔ان میں سے کسی ایک برجی ڈھانے کے جرم میں وہ کسی گوانتا ناموبے کی صلیب پر چڑھایا جا سکتا ہے ۔جہاں پہلے اس کے ہاتھ پاؤں قلم کیے جائیں گے اور اس کا ڈھڑ کتا دھڑ اپنے لہو سے اپنا چہرہ پونچ کر گویا وضو کرے گا اور اس کی لاش اس کی راکھ زمانوں کے فرات میں بہا دی جائے گی ۔پر اس کی راکھ کے ہر سرمئی ذرے کا قلب مطمئین اور شانت ہو گا ،اس میں مجروح پن کی جو دراڑیں پڑ چکی تھیں وہ سب کی سب مندمل ہو جائیں گی اور ہر ذرے کا قلب پھر سے دھڑ کنے لگے گا۔(۴۰)

خس و خاشاک زمانے کی ایک اور تکنیک گیارہ ستمبر کے اثرات کی طرف اشارہ کرتی ہے،اور یہ اشارہ ناول کے عنوان میں پنہاں ہے ،یعنی وقت اور زمانے گزر جاتے ہیں پھر بھی یاد رکھے جاتے ہیں۔

خس و خاشاک زمانے کی ایک اور نہایت پُر تاثیر تکنیک بین المتونیت (Intertextuality) پر بھی گیارہ ستمبر کے اثرات سے بہت گہرا تعلق ہے ۔بین المتونیت کو سادہ مفہوم میں متن کا کسی دوسرے متن سے تعلق کہہ سکتے ہیں ۔یعنی ایک متن کو سمجھنے کے لیے کسی دوسرے متن کا حوالہ ،یا سیاق وسباق کو بیان کرنا۔اس نظریے کا خالق جولیا کرسٹیوا (Julia Kristeva) ہے اس حوالے سے ڈاکٹر محمد اشرف کمال اپنی کتاب تنقیدی تھیوری اور اصطلا حات میں بیان کرتے ہیں:

> ایک متن کو پڑھتے ہوئے دوسرے متن کو حوالہ کے طور پر استعمال کرنا بین المتونیت کہلاتا ہے ۔۱۹۶۶میں جولیا کرسٹیوا نے اس حوالے سے اپنے نظریات کا اظہار کیا۔اس کے بقول جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ مصنف اور قاری کے درمیان معانی کی تفہیم نہیں ہو رہی ہے اور قاری ان معانی تک نہیں پہنچ پا رہا ہے جن تک مصنف ا

سے پہنچانا چاہتا ہے تو اس کے لیے دوسرے متن کا سہارا لیتا ہے۔(۴۱)

اس تکنیک کا استعمال بہت زیادہ کیا گیا ہے اور کئی متعدد حوالوں کے ساتھ مختلف متون ناول کے متن میں موجود ہیں، جو گیارہ ستمبر کے اثرات کو بخوبی ظاہر کرتی ہے۔انعام اللہ کا ورلڈ ٹریڈ سنٹر کے قریب ٹیکسی چلانا اور اچانک عمارتوں کا دھاکوں سے گونج اٹھنے کے ساتھ ساتھ انعام اللہ کی ٹیکسی میں نور جہاں کی جنسی سحر انگیز آواز میں ''میں تھاں مرجانی آن'' میں بڑی گہری معنویت پائی جاتی ہے۔اس کے علاوہ انعام اللہ کی شخصیت پر کسی قسم کی کوئی پابندی نہیں تھی،وہ مذہب اور ذات پات کی تمام قیود سے آزاد انسان ہے۔وہ کسی والدین کی اولاد نہیں ہے اس بات کی عکاسی انعام اللہ کے اپنے لکھے ہوئے ناول آٹو بائیو گرافی آف اے باسٹرڈ سے بخوبی سمجھ آجاتی ہے۔یہ سلسلہ یہیں پر ہی نہیں رکتا اس کے بعد جب انعام اللہ اپنے شروع کے دنوں میں امریکہ میں ٹیکسی ڈرائیور ہو جاتا ہے،اپنے ٹیکسی ڈرائیونگ کے دوران انعام اللہ پر مشائدے سے یہ بات بھی آشکار ہوتی ہے کہ ایک طوائف اور ٹیکسی ڈرائیور میں کوئی فرق نہیں ہوتا،دونوں کی کوئی مرضی نہیں ہوتی۔اس بات کو انعام اللہ اپنے ایک اور ناول ٹیکسی ڈرائیور از اے پیراسچی چیوٹ سے بیان کرتا ہے کہ انسان کی جبلی خصلتوں اور نفسیاتی اُلجھنوں کے بہاو کو صرف طوائف اور ٹکسی ڈرائیور ہی جان سکتے ہیں۔متن میں انعام اللہ کا ناول،ایک جاپانی زبان میں لکھا ہوا ناول ٹیل آف گینجی،اور امراو جان ادا سے اس تکنیک کو خوبی سے برتا گیا ہے۔

گیارہ ستمبر کے اثرات کو ظاہر کرنے کے لیے ایک مناسب موقعہ پر اس تکنیک کا استعمال مستنصر حسین تارڑ کی ناول نگاری کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی عمارت میں لگی آگ اور آٹھویں منزل سے ایک گرتے اور لڑھکتے ہوئے آدمی کی تصویر کو کیمرۓ میں محفوظ کر لیا گیا جس کی بنیاد پر ڈان ڈیلیو Don Delillo نے ایک علامتی ناول *Falling Man* تحریر کیا۔خس و خاشاك زمانے میں اس کا اظہار یوں کیا گیا ہے:

> وہ کھلے آسمان کے پس منظر میں قلابازیاں کھاتا نیچے آرہا تھا۔وہ ان دو سو کے قریب لوگوں میں سے ایک تھا جنہوں نے مختصر کھڑکیوں میں سے بے اختیار اور اپنے اوپر گرتی موت کی دہشت میں چھلانگ لگائی تھیں اور بعد میں اُن میں سے

ایک کی تصویر کو فالنگ مین کا نام دیا گیا تھا۔(۴۲)

گیارہ ستمبر کے سانحہ کے پس منظر میں استعمال کی گئی اسی تکنیک کے حوالے سے ڈاکٹر محمد سفیر اعوان بیان کرتے ہیں:

> 9/11 کے سانحہ کی فکر انگیز جھلکیوں میں ایک Image ورلڈ ٹریڈ سنٹر کے شمالی ٹاور سے گرتے ایک شخص کی تصویر تھی جڑواں ٹاورں کے انہدام سے پہلے اوپر والی منزلوں میں پھنسے کم وبیش دوسو لوگوں نے کود کر جان دے دی تھی۔ان میں سے ایک کی تصویر ایسوسی ایٹڈ پریس کے فوٹو گرافر رچرڈ ڈریور DrewRichard نے بنائی جسے ڈان ڈی للو Don de lillo کے ناول فالنگ مین Falling man نے امر کردیا ہے۔تارڑ نے گرتے ہوئے آدمی کی کہانی کو ڈرامائی انداز میں اِستعمال کیا ہے۔(۴۳)

خس و خاشاک زمانے میں بین المتونیت کی اصطلاح کو گیارہ ستمبر کے پس منظر میں استعمال کرتے ہوئے عمارتوں کی تباہی اور عمارتوں سے گرتے ہوئے لوگ اور زمین پر موت سے پھڑکتے اور بھاگتے ہوئے لوگوں کی عکاسی اس انداز سے کرتے ہیں:

> ٹیکسی نمبر 6M37۔۔۔تاریخ کی راکھ میں جیسے گرم لاوے میں ایک بستی روپوش ہوتی ہے۔وہ ٹیکسی دفن ہوتی گئی ...اوہ مائی گاڈ...بھگدڑ مچی ہوئی ہے ...خوفزدہ دہشت کے پنجوں میں پھڑکتے موت سے فرار ہونے کی کوشش میں چہرے...یہ یقیناً ایک حقیقت نہ تھی ....آرسن ویلز کے ناول وار آف دی ورلڈ کی شوٹنگ ہورہی تھی لیکن یہ کیسے کمال کے ایکسٹرا اداکار تھے کہ اُن کے خون سے نچڑ چکے چہروں سے شائبہ بھی نہ ہوتا تھا کہ وہ محض اداکاری کررہے ہیں۔اُن میں سے ہر ایک کے چہرے پر موت اور بے یقینی کے ایسے کمال کے تاثرات تھے کہ وہ سب بہترین اداکاری کے آسکر ایوارڈ کے حقدار تھے۔(۴۴)

فرانسز فوکویاما Francis Fukuyama نے اپنی کتاب تاریخ کا خاتمہ *The End of*

History میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ نظامِ حکومت کے اعتبار سے لبرل جمہوریت ہی سب سے اچھی حکمرانی ہے جبکہ اس کے متبادل نظامِ حکومت جن میں بادشاہت، وراثت، فسطائیت اور اشتراکیت ناکام ہو چکی ہیں یعنی لبرل جمہوریت انسانی نظریاتی ارتقاء کا آخری نکتہ ہوگا، اور اس بنیاد پر دنیا میں جنگیں نہ ہوں گی۔ لیکن اس کے جواب میں سموئیل پی ہنٹنگٹن نے تہذیبوں کا تصادم لکھی جس میں دعویٰ کیا تھا کہ آئندہ جنگوں کی بنیاد تہذیبوں پر ہوگی۔ افغانستان پر امریکی حملے نے اس نظریے کو درست ثابت کر دیا۔ خس و خاشاک زمانے میں ایک اور جگہ آٹھویں منزل سے انعام اللہ کی ٹیکسی پر گرنے والے کے ذریعے تہذیبوں کے تصادم کی تفہیم کو اس طرح سمجھانے کی کوشش کی ہے

> ٹیکسی نمبر 6M37 کے ماتھے پر اگرچہ (No Vacancy) کا سائن روشن تھا اور اس کے باوجود وہ کھڑکی میں سے کودنے والا لڑھکتا ہوا اُس کی ٹیکسی پر آن سوار ہوا تھا اور تاریخ کے کوڑے دان میں کوڑا ہونے سے پیشتر اپنی بٹن آنکھیں انعام اللہ پر مرکوز کر کے کہہ گیا تھا کہ.... تہذیبوں کا ٹکراؤ شروع ہو گیا ہے۔ (۴۵)

افغانستان پر امریکی حملے سے افغانستان میں بڑی تباہی اور ہلاکت ہوئی۔ جو لوگ پہلے ہی کھنڈروں میں رہتے تھے، اُن کو مزید کھنڈر کرنے کا کیا فائدہ تھا، جہاں لوگ پہلے ہی بھوک پیاس سے مر رہے تھے، اُن کو منی ایٹم بم سے مارنے کا کیا جواز تھا۔ مگر اس سب کے باوجود مغرب نے اپنے مست ہاتھیوں کے ساتھ افغانستان پر ہر قسم کے کیمیائی ہتھیاروں سے حملہ کر دیا، جنہوں نے بچوں تک کے جسموں کو پارچوں میں تقسیم کر دیا، افغان اور غیر افغان کے تمام فرق ختم ہو گئے۔ اس حوالے سے مستنصر حسین تارڑ کا بڑا جامع ناول قلعہ جنگی کے پلاٹ کو خس و خاشاک زمانے میں یوں بیان کیا ہے کہ اس سے افغانستان کی تباہی کی معنوی تفہیم آسان ہو جاتی ہے۔ خس و خاشاک زمانے کے پلاٹ میں قلعہ جنگی کے حوالے سے بیان کرتے ہیں:

> قلعہ جنگی کے تباہ شدہ کھنڈروں میں بکھری لاشیں جنہیں ڈیزی کٹر بموں نے کیا نفاست سے پارچوں میں تراش ڈالا تھا... اُن کے تلے تہہ خانے میں محصور جب ایک حواس باختہ، بھوک سے مسمار ہوتا امریکی طالبان باہر آتا ہے تو اپنے چہرے پر

پڑتی فلیش لائٹ کی تاب نہ لا کر آنکھیں بند کر لیتا ہے اور بڑبڑاتا ہے آئی وِل ڈو
اُٹ اگین ..(۴۶)

بین المتون کی تکنیک کے ذریعے مستنصر حسین تارڑ نے گیارہ ستمبر کے تمام تانوں بانوں کو اجاگر کیا ہے خس و خاشاک زمانے میں بہت سے ادبی طریقوں کا استعمال کیا ہے جو مفہوم کی تفہیم میں بڑا کارآمد ہے۔ لیکن اس قسم کی تمام تکنیک کے استعمال کے لیے ان پر مہارت ضروری ہے، ورنہ اچھی سے اچھی تکنیک بھی لطف نہ دے گی ۔اس لحاظ سے مستنصر حسین تارڑ نمایاں ناول نگار ہیں جنہوں نے ان تکنیک کو بیان کرتے ہوئے ایک ایسا ناول لکھ کر ناول نگاری کے نئے رجحان کو جنم دیا ہے۔

ایک اور بڑی ہی پُر لطف تکنیک کے ذریعے گیارہ ستمبر کے اثرات کو بیان کیا گیا ہے۔ ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی عمارتوں کو ٹی وی سکرین پر مختلف زاویوں اور مختلف طریقوں سے یوں دکھایا گیا ہے کہ ایک عمارت ایک خاص ترتیب سے دوسری عمارتوں کے اُوپر گرتی ،دھول اڑاتی ،لوگوں کی روحوں کو قبض کرتی ہوئی ڈھے جا رہی تھی۔ مستنصر حسین تارڑ نے عمارتوں کے گرنے کے عمل کو اس طرح ظاہر کیا ہے جیسے خس و خاشاک زمانے۔ جیسے وقت گزر کر خس و خاشاک ہو جاتا ہے ۔مستنصر حسین تارڑ بیان کرتے ہیں:

ہر منزل اپنے سے نیچے والی منزل پر گرتی اس پر اپنا ملبہ بوجھ کرتی تاش کے پتوں کی مانند منہدم ہوتی چلی جا رہی تھی ۔جس سرزمین پر آج تک کسی عمارت کی ایک اینٹ بھی نہ کھسکی تھی وہاں اُس کے وجود میں جتنی بھی اینٹیں تھیں وہ ڈھیتی جا رہی تھیں ۔اور ایک ملفوف گونج انعام اللہ کے کانوں میں ایک رک جانے والے دل کی طرح دھک دھک کرتی اُترتی تھی ...وہ دونوں ٹاور گویا روئی کے گالے تھے جو اُڑتے جا رہے تھے۔(۴۷)

گیارہ ستمبر کا واقعہ پہلے ہوتا ہے اور اس سانحہ کے بعد ضیاء الحق کا مستحکم دور کا ذکر آجاتا ہے ۔اور اس کے بعد پھر سے مصنف گیارہ ستمبر کے سانحہ کو بیان کرتا ہے ،یعنی گیارہ ستمبر کے اثرات کو Stream of Consciousness کی تکنیک کے ذریعے بھی بیان کیا ہے۔

مستنصر حسین تارڑ کا ناول خس و خاشاک زمانے اپنے پلاٹ ،تکنیک ،اُسلوب، ہیت، تھیم ،اور

کردار نگاری کی بناء پر ایک ممتاز ناول ہے ۔ایک عمدہ ناول تخلیق کرنا آسان نہیں ۔ناول کی تخلیق کے لیے قدرت کی عطا کردہ ناول کی تخلیق کا بھی ہونا ضروری ہے ۔اس لحاظ سے مستنصر حسین تارڑ خوش قسمت ہیں کہ اُن کو قدرت نے ناول نگاری کا مکمل جوہر عطا کیا ہے۔خس و خاشاک زمانے کا تھیم ماریو برگس یوسا کی تھیم کے بارے میں کی گئی تعریف پر پورا اُترتا ہے۔ماریو برگس یوسا بیان کرتے ہیں:

> وہ لکھنے والے جو اپنے جن بھوتوں سے دور دور رہتے ہیں اور اپنے لیے تھیموں کو باہر سے مقرر کرتے ہیں کیوں کہ اُنہیں لگتا ہے کہ اُن کے اپنے تھیم طبع زاد اور کافی پُرکشش نہیں بڑی بھاری غلطی کے مرتکب ہوتے ہیں ۔کوئی ادبی تھیم اپنے میں اچھا ہوتا ہے نہ برا۔کوئی بھی تھیم اچھا ہوسکتا ہے یا بُرا لیکن اس کا فیصلہ بذاتِ خود تھیم پر منحصر نہیں ہوتا بل کہ اس کی حبِ ہیت (فارم)،یعنی بیانیہ اُسلوب ، اسٹائل اور واضع اسٹرکچر کا اطلاق اسے ناول بناتا ہے تو اس کے بعد اس کی کیا شکل بنتی ہے ۔ہیت ہی ہے جس میں تھیم ادا کیا جاتا ہے ۔کسی کہانی کو طبع زاد یا فضول ،عمیق،یا سطحی،پیچیدہ یا سادہ بناتی ہے جو کرداروں کو گہرائی ابہام،اور معتبریت بخشتی ہے یا انہیں بے جان،مضحکہ خیز خاکوں میں بدل دیتی ہے،کسی کٹھ پتلی باز کی تخلیقات میں یہ ادب کے معدودِ چند اصولوں میں کا ایک اور اصول ہے جو میں سمجھتا ہوں ،کسی اشتثنا کا متحمل نہیں ہوسکتا ہے،ایک ناول کے تھیم اپنے طور پر کچھ دینے کا وعدہ نہیں کرتے ،کیوں کہ ان کے اچھے یا بُرے جاذب یا پھیکے میٹھے ہونے کا فیصلہ صرف اس بات سے کیا جائے گا کہ ناول نگار نے انھیں کس طرح الفاظ کی حقیقت میں ڈھالا ہے ۔جس کی ایک خاص ترتیب سے درجہ بندی کی گئی ہے ۔(۴۸)

مندرجہ بالا تمام بحث سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ خس و خاشاک زمانے کے پلاٹ اور استعمال کی گئی تکنیکوں پر گیارہ ستمبر کے اثرات نمایاں طور پر مرتب ہوئے ہیں ۔

حوالہ جات

1۔ نجیبہ عارف، 9/11اور پاکستانی اردو افسانہ، پورب اکادمی، اسلام آباد، سن ۲۰۱۱ء، ص ۲۲

2۔ احسن فاروقی، ڈاکٹر، ناول کیا ہے؟ دردا کادمی، لاہور، سن ۱۹۶۴ء، ص ۲۳، ۲۴

3۔ مستنصر حسین، تارڑ، قلعہ جنگی، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، سن ۲۰۰۸ء، ص ۵

4۔ صاحبزادہ حمید اللہ، فن اور تکنیک، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، سن ۱۹۹۰ء، ص ۲۰۱

5۔ مستنصر حسین، تارڑ سے گفتگو، دانش محمود، ڈاکٹر قراۃ العین طاہرہ، مشمولہ، تسطیر، شمارہ ۲، مدیر نصیر احمد ناصر، لاہور، ص ۷۶

6۔ مستنصر حسین، تارڑ، قلعہ جنگی، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، سن ۲۰۰۸ء، ص ۱۶

7۔ مستنصر حسین، تارڑ سے گفتگو، دانش محمود، ڈاکٹر قراۃ العین طاہرہ، مشمولہ، تسطیر، شمارہ ۲، مدیر نصیر احمد ناصر، لاہور، ص ۷۶

8۔ مستنصر حسین، تارڑ، قلعہ جنگی، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، سن ۲۰۰۸ء، ص ۳۷، ۳۸

9۔ محمد یٰسین، ڈاکٹر، ناول کا فن اور نظریہ، دارالنوادر، لاہور، سن ۲۰۱۳ء، ص ۹

10۔ مستنصر حسین، تارڑ، قلعہ جنگی، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، سن ۲۰۰۸ء، ص ۶۱

11۔ ایضاً، ص ۱۱۳

12۔ ایضاً، ص ۲۱۵

13۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، تنقیدی اصطلاحات: توضیحی لغت، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، سن ۲۰۱۱ء، ص ۹۳

14۔ ممتاز شیریں، معیار، نیا ادارہ سویرا آرٹ پریس، لاہور، سن ۱۹۶۳ء، ص ۱۶

15۔ ممتاز احمد، ڈاکٹر، اردو ناول کے ہمہ گیر سروکار، فکشن ہاؤس، لاہور، سن ۲۰۱۲ء، ص ۶۹

16۔ مستنصر حسین، تارڑ، قلعہ جنگی، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، سن، ۲۰۰۸ء، ص، ۳۷

17۔ ایضاً، ص، ۵

18۔ ایضاً، ص،

19۔ ممتاز شریں، معیار، نیا ادارہ سویرا آرٹ پریس، لاہور، سن، ۱۹۶۳ء ص، ۲۵

20۔ مستنصر حسین، تارڑ، قلعہ جنگی، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، سن، ۲۰۰۸ء، ص، ۳۰

21۔ ایضاً، ص، ۶

22۔ ایضاً، ص، ۵۴، ۵۵

23۔ ممتاز احمد خان، ڈاکٹر، اردو ناول کے چند اہم زاویے، انجمن ترقی اردو، کراچی، سن، ۲۰۰۳ء، ص ۲۶۹

24۔ مشرف عالم ذوقی، سلسلہ روز و شب، اردو ناولوں کا خصوصی مطالعہ اور دیگر مضامین، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس، دہلی، سن، ۲۰۱۴ء، ص ۱۵

25۔ مستنصر حسین، تارڑ، خس و خا شاک زمانے، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، سن ۲۰۱۳ء، ص، ۴۱۵

26۔ ایضاً، ص ۴۳۰

27۔ ایضاً، ص، ۴۰۹

28۔ پرویز مشرف، جنرل (ر) سب سے پہلے پاکستان، فیروز سنز لمیٹیڈ، لاہور، لاہور، سن، ۲۰۰۶ء، ۲۵۳

29۔ مستنصر حسین، تارڑ، خس و خا شاک زمانے، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، سن ۲۰۱۳ء ص، ۵۱۰

30۔ مستنصر حسین، تارڑ خس وخاشاک زمانے سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، سن ۲۰۱۳ء ص، ۵۰۵

31۔ سفیر اعوان، محمد، ڈاکٹر، نگری نگری گھومنے والا مسافر، مشمولہ، چہار سُو، شمارہ مارچ اپریل ۲۰۱۵ء،

مدیر،گلزار جاوید،راولپنڈی،سن،۲۰۰۶ء،ص،۴۳

32۔ مستنصر حسین تارڑ،خس و خاشاک زمانے،سنگِ میل پبلی کیشنز،لاہور،سن،۲۰۱۳ء،ص،۵۰۴

33۔ مستنصر حسین،تارڑ،قلعہ جنگی،سنگِ میل پبلی کیشنز،لاہور،سن،۲۰۰۸ء،ص،۱۳

34۔ مستنصر حسین،تارڑ،خس و خاشاک زمانے،سنگِ میل پبلی کیشنز،لاہور،سن،۲۰۱۳ء
ص،۵۰۹،۵۱۰

35۔ خالد جاوید،کہانی موت اور آخری بدیسی زبان،ایجوکیشنل
ہاوس،دہلی،سن،۲۰۰۸ء،ص،۳۷

36۔ مستنصر حسین تارڑ،خس و خاشاک زمانے،سنگِ میل پبلی کیشنز،لاہور،سن،۲۰۱۳ء،ص،۵۰۶

37۔ ایضاً،ص،۵۷۹

38۔ ایضاً،ص،۷۴۰

39. Dr Safeer awan,post-modern novelistic,techniques 2015 in khas-o-khashak zamanay,meyar,january,june,editor,Dr.Aziz Ibnul hasan,islamic university p,21 Islamabad,

40۔ مستنصر حسین،تارڑ،خس و خاشاک زمانے،سنگِ میل پبلی کیشنز،لاہور،سن،۲۰۱۳ء،ص،۷۲۸

41۔ اشرف کمال،محمد،ڈاکٹر،تنقیدی تھیوری اور اصطلاحات،مثال پبلشرز،فیصل آباد،
سن،۲۰۱۶ء،ص،۱۵۰

42۔ مستنصر حسین تارڑ،خس و خاشاک زمانے،سنگِ میل پبلی کیشنز،لاہور،سن،۲۰۱۳ء،ص،۴۲۱

43۔ سفیر اعوان،محمد،ڈاکٹر،نگری نگری گھومنے والا مسافر،مشمولہ،چہار سُو،شمارہ،مارچ اپریل،۲۰۱۵ء
مدیر،گلزار جاوید،،راولپنڈی،ص،۴۳،

باب چہارم

قلعہ جنگی اور خس وخا شاک زمانے میں کرداروں کے شخصی ارتقاء پر 9/11 کے اثرات

قلعہ جنگی کے کرداروں پر 9/11 کے اثرات

قلعــہ جنگی مستنصر حسین تارڑ کا ایک نمایاں ناول ہے، جو افغانستان پر امریکی حملے کے پس منظر میں لکھا گیا ہے ۔افغانستان کی اس صورتِ حال کو سات کرداروں کے ذریعے پیش کیا گیا ہے جو شدید زخمی حالت میں تہہ خانے کے اندر موجود ہیں ۔ یہ تہہ خانہ لاشوں سے بھرا ہوا ہے، اور ان لاشوں کے اُوپر یہ کردار بھی زخمی حالت میں اپنی بقاء کی جنگ لڑنے میں مصروف ہیں

پہلا کردار اللہ بخش کا ہے جو ناول کا اہم کردار ہے ۔اللہ بخش کا تعلق پاکستان سے ہے ۔ 9/11 سے پہلے وہ اپنی نانی اماں کے پاس رہتا تھا، جو دل و جان سے اُس کو پیار کرتی تھیں، دودھ میں بادام گھوٹ گھوٹ کر پلاتی تھیں ۔اس حوالے سے مستنصر حسین تارڑ لکھتے ہیں :

> نہیں بھائی مرتضیٰ اب یہ حربہ کام نہیں کرتا ۔۔میں اتنی بار خیال ہی خیال میں اپنی نانی جان کے پاس گیا ہوں کہ گرمیوں کے روزے ہیں پیاس سے میرا حبشہ کیکر کا کانٹا ہو رہا ہے اور وہ دَوری میں چھلکے اتارے بادام گھوٹ رہی ہے.پھر اُن میں دودھ ملاتی ہیں اور ابھی سورج سر پر ہے اور وہ کہتی ہیں اللہ بخش پتر تو ابھی بال ہے تیرا روزہ آدھا ہے اس لیے کھول لے ...میں تانبے کا بھاری گلاس منہ سے لگا کر وہ دودھیا گاڑھا دودھ غٹ غٹ پی جاتا ہوں، اور میرا حلق ٹھنڈا ہو جاتا ہے ... پر اب یہ حربہ بیکار ہو گیا ہے کام نہیں کرتا ... پہلے خیال ہی خیال میں پیاس بجھ جاتی تھی اور میں اس نامراد تہہ خانے میں بھوکا پیاسا نانی جان کے ہاتھوں کا بنایا ہوا دودھ اپنے حلق میں اترتا محسوس کر لیتا تھا...لیکن اب نہیں ...میرا حبشہ کیکر کے کانٹوں سے بھرا رہتا ہے پیاس مجھے خشک کرتی ہے ۔(۱)

یہ سب کچھ جس کو اللہ بخش یاد کر رہا ہے 9/11 سے پہلے کی یادیں ہیں ۔ زندگی میں کسی قسم کا دکھ نہ تھا ۔ نانی جان دودھ میں بادام ملا کر دیا کرتی ۔اللہ بخش کا دادا اور نانکے دونوں کا پیشہ میراثی پن تھا، جس کو ہمارے معاشرے میں برا سمجھا جاتا ہے ۔جس پیشے کو ہمارے مولوی نجیب الطرفین کہتے ہیں ۔ان کے گھر والوں کا کام چوہدریوں کے حقے بھرنا، جگتیں کر کے اُن کا دل بہلانا مخول کرنا، اور مانگنے کے لیے ہر وقت اُن کے سامنے

جھولی پھیلانا تاکہ کھانے پینے کا کام چلتا رہے ۔اگر جھولی میں کچھ ڈال دیا جاتا تھا تو عید ہو جاتی ورنہ بھوکے سونے میں بھی کچھ عار نہ تھی ۔کھیتوں میں گرے پڑے سٹے جمع کر کے اُن میں سے چاول نکال لیا کرتے تھے اور گڑ کے ساتھ کھاتے ۔اِن دو کاموں کے علاوہ اُن کے گھر والوں کو کچھ اور کام نہ آتا ،البتہ ان میں سے جن کو ڈھول بجانا آجاتا وہ شہر میں جا کر موسیقار بن گئے باقی سارا گاؤں ان جیسے کمی کمینوں پر مشتمل تھا۔

اللہ بخش جمعہ پڑھنے مسجد جاتا ہے تو وہاں ایک افغانی آیا ہوا تھا جس نے تقریر میں شہادت کا رتبہ بیان کیا ،کافروں کے ظلم کی داستانیں بیان کیں ۔ان کی باتوں کا اللہ بخش پر بڑا اثر ہوا۔اس واقعہ کا ذکر ناول میں اس طرح کیا گیا ہے:

> ایک دفعہ ناں میں جمعہ پڑھنے کے لیے میں مسجد میں گیا تو وہاں ایک افغانی آیا ہوا تھا، مولوی صاحب کی آنکھیں بھری ہوئی تھیں اور اُن کے آنسو داڑھی پر گرتے اور انہوں نے ہمیں بتایا کہ یہ مجاہد ہے اور اللہ تعالٰی کا خاص بندہ ہے، بہت دور سے آیا ہے۔اس کا واعظ سنو ... اس افغانی نے بڑے درد ناک قصے سنائے ...کافروں کے ظلم کے داستانیں سنائی ،...اللہ رسول کے واسطے دیے ،شہادت کا مرتبہ بیان کیا اور کہا کہ اسلام کی مدد کے لیے چندہ دو ...جتنے بھی نمازی تھے اُن کے پاس جو کچھ تھا انہوں نے افغانی کی جھولی میں ڈال دیا اور سبھی آہ و زاری کر رہے تھے اُس نے نوٹ اکھٹے کیے اور اگلے گاؤں چلا گیا ...سو جی مجھ پر بڑا اثر ہوا(۲)

اللہ بخش پر مولوی کی باتوں کا بڑا اثر ہوا۔لیکن اس کے بعد اللہ بخش ایک بونے کے کہنے پر جہاد میں شامل ہوا۔مستنصر حسین تارڑ لکھتے ہیں

> آہو بونے سب کو نظر نہیں آتے ۔۔۔جب کیچڑ میں سے ایک بونا نکلا۔۔۔اور اینٹوں میں اپنے پنجے گاڑتا ایک بندر کی طرح میرے برابر میں منڈیر پر آنکلا ...آہو ...قسم ایمان کی سچ کہتا ہوں ....اُس کی شکل عجیب سی تھی ۔تھا تو انسان پر لگتا نہیں میری انگلی سے بھی چھوٹا ہو گا پر اُس کی داڑی میرے ہاتھ جتنی لمبی تھی ،کیچڑ میں

> لت پت ....جسے وہ اپنی چھوٹی چھوٹی مٹھیوں میں بھینچ کر نچوڑتا تھا...آنکھیں گول گول تھیں بنٹوں کی طرح اور ہاں بالکل ننگا تھا...ننگ پتنگا...اور جب وہ بولا تو اُسی افغانی بابا کی آواز میں جو مسجد میں چندہ مانگنے آیا تھا...اور اُس نے بھی وہ ہی دردناک قصہ سنائے ،کافروں کے ظلم کی داستانیں سنائی ،شہادت کا مرتبہ بیان کیا اور کہنے لگا تم جہاد کرو اور اسلام پر قربان ہو جاو...میں ڈرا ہوا تو بہت تھا پر میں نے ہمت کر کے پوچھا... پر کیسے قربان ہو جاؤں ـ ـ کہنے لگا فوراً اکوڑا خٹک پہنچو وہاں تمہارا انتظار ہو رہا ہے ـ ـ ـ.(۳)

اللہ بخش مولوی کی تقریر کے بعد ایک بونے کے کہنے پر جہاد میں شامل ہوا تھا ـ وہ گھر سے کسی کو بغیر بتائے نکلا اور اکوڑا خٹک کے ایک مدرسے میں داخل ہو گیا ـ اس مدرسے میں اُس کو وہ سب سہولیات میسر آ گئی جن کا 9/11 سانحہ سے پہلے اُن کی زندگی میں تصور بھی نہ تھا وہ اس مدرسے میں بڑا خوش تھا ـ اس حوالے سے مستنصر حسین تارڑ ناول میں بیان کرتے ہیں :

> ...تو جناب عالی میں کسی کو بتائے بغیر گھر سے نکلا اور کسی نہ کسی طرح اکوڑا خٹک پہنچ گیا ...بڑی موج تھی ...تین کپڑے اور چپل ملی ...اور ساتھ مفت میں دینی تعلیم بھی...میرے ساتھ جتنے طالبان تھے اُن میں سے بیشتر مجھ ایسے ہی تھے ... پتہ نہیں اُنہیں بھی بونے ہی نے ادھر بھیجا تھا ...شہروں کے لڑکے بھی تھے جو اتنے غریب غربا تھے کہ سکولوں کی فیس نہیں دے سکتے تھے ...تو اس مدرسے میں بڑی موج تھی اب اگر وہ موج کراتے ہیں تو یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اُٹھ اللہ بخش افغانستان جا اور جہاد کر ـ ـ ـ.(۴)

لیکن 9/11 سانحہ کے بعد اللہ بخش قلعہ جنگی کے تہہ خانے میں زخمی حالت میں ہے ـ تہہ خانے کے اندر ایک گھوڑا نظر آنے پر اُس کا ایک ساتھی مجاہد گھوڑا مارنے کو کہتا ہے تو اللہ بخش انکار کر دیتا ہے کہ وہ کس طرح ایک گھوڑے کو مارے ـ اللہ بخش کہتا ہے :

> بھائی مجھے آزمائش میں نہ ڈالنا...اللہ بخش جان گیا کہ اب شاید اُس کا نام

پکارا جائے، مجھے پتا ہی نہیں کہ گھوڑے کو کیسے مارتے ہیں۔(۵)

اس تہہ خانے کو جو لاشوں سے بھرا پڑا ہے، اچانک اس میں پانی چھوڑ دیا جاتا ہے تا کہ اگر اس میں کوئی زندہ شخص چھپا ہو تو ڈوب کر مر جائے۔ اب سارا تہہ خانہ ایک جھیل کا منظر پیش کر رہا تھا، اور اس جھیل میں اللہ بخش کی لاش تیرتی پھر رہی تھی۔ ناول میں اس منظر کو یوں بیان کیا ہے

> کنواں کی تہہ سے برآمد ہونے والے بونے کو دیکھ کر خوشی سے ہو ہو کرتا اللہ بخش تھا اور وہ تیراکی نہیں جانتا تھا...جوہڑوں میں پلنے والا اتنی شیشہ جھیل کے پانیوں میں ڈبکیاں کھاتا ہاتھ پاؤں مارتا اللہ بخش تھا۔(۶)

9/11 سے پہلے اور بعد کے زندگی کے یہ اتار چڑھاؤ اللہ بخش کے تھے جو ایک بونے کے کہنے پر جہاد میں شامل ہو کر افغانستان جا پہنچا تھا

قلعہ جنگی کا دوسرا کردار عبدالوہاب خادمین حرمین شریفین کے ارتقاء پر بھی 9/11 کے اثرات موجود ہیں۔ 9/11 کے سانحہ سے پہلے وہ ایک عام شہری تھا۔ اور ایک اچھے شہری کے تمام اوصاف اس کردار میں موجود ہیں۔ اس کا تعلق سعودی عرب سے ہے، اور آلِ سعود کی اولاد میں سے ہے۔ اس کے علاوہ اپنے آپ کو خادمین حرمین شریفین کہتا ہے۔ کیمرج یونیورسٹی سے علم الانسان کی ڈگری بھی نمایاں پوزیشن سے حاصل کی۔ حالانکہ ایک سعودی کا اتنا پڑھا لکھا اور قابل ہونا ایک حیرت ناک بات تھی۔ اپنا تعارف یہ کردار اس طرح کرواتا ہے

> میں آلِ سعود میں سے ہوں ....خادمین حرمین شریفین میں سے ہوں ...اگرچہ مجھے اُن کی خادمیت کی اجازت نہ تھی۔ اس لیے کے میرے بھیجے میں اور طرح کی سو چیں وار کرتی تھیں وہ صرف حرمین خادمین نہ تھے ....سفید گھر کے خادم تھے ...میں بڑا بول نہیں بول رہا، تکبر نہیں کر رہا لیکن میں تم سب سے زیادہ پڑھا لکھا ہوں ...میں نے کیمرج یونیورسٹی سے علم الانسان کی ڈگری نمایاں پوزیشن میں حاصل کی تھی ...میرے پروفیسر یقین نہ کر سکتے تھے کہ عام طور پر ایک سعودی اول تو کیمرج کے کسی کالج میں داخل ہونے کے معیار پر پورا نہ اترتا تھا اور اگر داخل ہو جاتا تو

> اسے مزید تعلیم سے شغف نہ ہوتا تھا۔اس لیے میرے پروفیسر میرے سعودی نژاد ہونے پر شک کرتے تھے ،اگر چہ میں تھا...لیکن اس اعلیٰ تعلیم نے مجھے کوئی رستہ نہ سجھایا کوئی راہ نہ دکھائی اور مجھے احساس ہوا کہ یہ سب علم اور آگہی محض سراب ہے۔(۷)

اس کردار کے بہت سے بہن بھائی تھے ،اتنے تھے کہ اُن کے والد بھی اُن کے نام نہ جانتا تھا بلکہ اپنے خادم سے پوچھتا کہ جو اتنے برس کا ہے اس کا کیا نام ہے۔ان کے والد کو جرمن عورتیں بہت پسند تھیں ،اس لیے وہ ہر سال دو ماہ کے لیے جرمنی جاتا تھا،وہ ہیمبرگ کی گلیوں اور بازاروں میں گشت کرتے ہیں ،فٹ پاتھوں ،آفس گرلز،گھریلو عورتیں ،سٹور میں شاپنگ کرتی ہوئی لڑکیاں ،یونیورسٹی کی طالبات ،حتیٰ کہ سڑکوں سے کوڑا اُٹھانے والی خواتین ،کو عقاب کی آنکھوں سے دیکھتے تا نکہ اُن کی آنکھیں عورت کے بدن کی پیمائش کو اپنے جنسی طلب کے معیار پر ناپ لے۔

یہ تمام باتیں 9/11 سے پہلے ان کرداروں کی زندگی کی عکاسی کرتی ہیں ۔عبدالوہاب کیمرج کے تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود طالبان میں کس طرح شامل ہوئے یہ بھی ایک فکر انگیز بات ہے۔کیمرج سے تعلیم حاصل کر کے جب وہ اپنے وطن واپس آیا تو یہ اُن کے لیے بہت مشکل تھا کہ وہ سعودی بادشاہت کے سامنے مُہر بہ لب رہے،اور یوں ہی سدا اُن کے سامنے جھکتا رہے ،یہ بھی حیران کن بات تھی کہ یہ قانون صرف سعودی شہریوں پر ہی لاگو ہوتا تھا ،اور جب کوئی امریکی اُن سے ملنے آجاتا تو وہ فوراً اُن کے سامنے جھک جاتے ،یہ سبب ہی اُن کا طالبان میں شامل ہونے کا بنا۔عبدالوہاب کہتا ہے:

> میں نے بتایا ہے کہ ...کیمبرج کے قیام نے مجھے بہت بدل دیا تھا..ایک سخت گیر بادشاہت کے ہر مُہرے کے سامنے مُہر بہ لب رہنا اور اس کے سامنے جھکتے چلے جانا میرے لیے دشوار ہوتا گیا...اس بادشاہت میں اگر چہ قانون کی سختی مثالی تھی لیکن اس سختی کے سامنے جب کوئی امریکی یا یورپی آتا تو وہ موم ہوجاتی تھی ان غیر ملکیوں کی موجودگی اور ان کی قانون سے برتری میری عزت نفس کو مجروح کرتی تھی ....وطن ہمارا تھا،لیکن حکمرانی ان کی تھی فوجی اڈے ان کے تھے جن کے اندر سعودی

جنرل بھی نہیں جا سکتے تھے۔(۸)

عبدالوہاب اُس وقت طالبان کے ساتھ شامل ہوا جب افغانستان میں روسیوں نے چڑھائی کردی تھی، امریکہ پہلے ان طالبان کو ہیرو قرار دیتا تھا۔ان کو مجاہد اعظم کا لقب بھی عطا کیا۔حالانکہ امریکہ کے لیے وہ بھی ایک 9/11 تھا لیکن اس وقت لوگ اس صورتِ حال کو سمجھنے سے قاصر تھے۔بہت سے دوسرے عرب جوانوں کی طرح وہ بھی یہاں آ نکلے اور القائدہ کے اسیر ہو گئے۔عبدالوہاب اس صورتِ حال کو اپنے لفظوں میں بیان کرتے ہیں:

پھر یہاں افغانستان میں روسیوں کی حماقت کا اغاز ہو گیا ...ہزاروں عرب ادھر آ نکلے اور القائدہ کے اسیر ہو گئے، میں بھی ان میں سے ایک تھا...ان دنوں امریکہ یورپ ہماری پیٹھ تھپکتا تھا،ہمیں مجائدین کہا جاتا تھا اور ہماری جھولیاں ڈالروں اور ہتھیاروں سے بھر دی جاتی تھیں۔یہی امریکہ مسلمان ملکوں کے نوجوانوں کو مقدس جہاد کے لیے ابھارتا تھا،بھرتی کرتا تھا،ٹریننگ دیتا اور یہاں بھیج دیتا تھا...تمہیں پتا ہے کہ ادھر القائدہ کے جتنے بھی کیمپ ہیں اور تورا بورا اور گردیزی میں غاروں کا جو وسیع جال ہے، یہ سب امریکہ کی نگرانی میں وجود میں آئے۔ہم ان کے ہیرو تھے۔ان کا بڑا ہیرو ریمبو بھی ہمارے شانہ بشانہ لڑتا تھا۔لیکن جونہی ''بدی کی سلطنت'' کا خاتمہ ہوا وہ ہاتھ جھاڑ کر نکل گئے کہ ان کا مقصد پورا ہو چکا تھا...ہم وہی مجائدین اور ہیرو تھے جو 11 ستمبر کے بعد دہشت گرد اور بد ترین مجرم بن گئے۔(۹)

یہ عبدالوہاب کی 9/11 سے پہلے کی زندگی کی کہانی تھی،لیکن 9/11 کے بعد یہ کردار بھی اس تہہ خانے میں موجود ہے۔بم کے ٹکڑے اس کے جسم میں پیوست ہیں۔بری طرح زخمی ہے اور یہ اس تہہ خانے میں دوسرے نمبر پر آ کر گرا تھا۔اب اس تہہ خانے میں عبدالوہاب کی حالت یہ ہے:

عبدالوہاب کے جبڑے میں تھوڑی سی کپکپاہٹ ہوئی،وہ بہت دیر سے اوندھا پڑا ہوا

تھا اور اُسے بہت دیر لگی سیدھا ہونے کی کوشش میں اس کے منہ میں مٹی بھری ہوئی تھی۔ یہ مٹی بہت دیر سے اس کے منہ میں تھی ابھی تک نم ہو کر کیچڑ میں نہیں بدلی تھی کیونکہ اس کے منہ میں لعاب کب کا خشک ہو چکا تھا، جن خلیوں سے وہ پھوٹتا تھا وہ مردہ ہو چکے تھے، اس لیے یہ مٹی ابھی تک خشک تھی ...عبدالوہاب نے اس مٹی کو تھوکنے کی سعی کی تو وہ غبار بن کر اس کی آنکھوں کے سامنے تن گئی اور وہ کھانسنے لگا (۱۰)۔

اس تہہ خانے میں مرنے سے پہلے عبدالوہاب اپنی سابقہ زندگی کو بھی یاد کرتا ہے کہ وہ کس طرح جھیل میں نہایا کرتا تھا، جہاں پر اُس کی ساتھی جینیفر بھی ہوتی تھی۔ جس کے پاؤں پر اکثر اُس کا پاؤں آجاتا تھا۔ اس لیے جب ان مجائدین کو مارنے کے لیے تہہ خانے میں پانی چھوڑا جاتا ہے تو وہ کچھ دیر تک تیرتے ہوئے اپنے آپ کو پانی میں ڈوبنے سے بچائے رکھتا ہے۔ لیکن ایک بھاری دھماکے کے سبب شہید ہو جاتا ہے۔ مرنے سے پہلے وہ اس تہہ خانے میں اپنے کیمبرج کے دنوں کو یاد کرتا ہے:

وہ ڈبکی لگا کر پانیوں کے اندر جو نیلا آسمان تھا، اس میں تیر رہا تھا... یہاں کوئی آواز نہ تھی ...کلاشنکوف کی کانوں کے پردے کٹ کٹ کاٹنے والی آواز کوئی دھماکا نہ تھا ڈیزی کٹر اور کلسٹر بم کے زہریلے گرم آہنی ٹکڑے نہ تھے ...ایک نیلی خاموشی تھی اور کیمبرج کا ''مے بال'' تھا....ماہ مئی میں منعقد کیا جانے والا سالانہ رقص ...اور جینیفر تھی ...وہاب تم ناچتے تو بہت اچھا ہو لیکن بار بار میرے پنجوں پر پاؤں رکھ دیتے ہوئے ایک اونٹ کی طرح ....اس لیے جینیفر کے میں ایک اونٹ ہو ں جو تمہارے عشق میں دیوانہ ہو کر بے اختیار ہو گیا ہو اور بلبلاتا ہوں ..تمہاری نیلی آئرش آنکھوں میں جو نخلستان ہے، اُن کے چشموں سے اپنی پیاس بجھانا چاہتا ہوں ...ہم عربوں میں پیاس بہت ہوتی ہے۔(۱۱)

عبدالوہاب 9/11 سے پہلے شاندار زندگی گزار رہا تھا، کیمبرج کا تعلیم یافتہ تھا، ہر فکر سے آزاد تھا لیکن 9/11 کے بعد تہہ خانے کے اندر زخمی حالت میں آ کر گرا تھا اور پھر کئی روز تک اپنی زندگی کی جنگ لڑتا رہا اور آخر

کار اسی تہہ خانے میں جاں بحق ہو گیا

تیسرا کردار مرتضٰی بیگ کا ہے۔جو چوری چھپے آ کر طالبان میں شامل ہوا تھا اُن کے والد ارتضٰی بیگ بھی چوری چھپے افغانستان آیا کرتا تھا۔یہ وہ دور تھا جب طالبان ''بدی کی سلطنت'' کا خاتمہ کرنے میں مصروف تھے۔مرتضٰی بیگ کا والد ''سی آئی اے'' کی ٹیم کا حصہ تھا۔اور اُن کی ذمہ داری کراچی پورٹ پر لنگر انداز جہازوں سے اترنے والا اسلحہ کی نگرانی کرنا تھا۔یہ تمام اسلحہ افغانستان پہنچایا جاتا تھا،اور مجاہدوں کے گروپوں میں تقسیم کیا جاتا تھا۔

مرتضٰی بیگ کا والد ریٹائرمنٹ کے بعد ایک معزز سیاستدان بن گیا اور ریٹائرمنٹ کے بعد بھی ایک شاندار زندگی بسر کرنے لگا۔مرتضٰی بیگ اپنے والد کے کارناموں پر لکھی گئی کتابوں کا مطالعہ کرتے ہوئے جوان ہوا تھا۔مستنصر حسین تارڑ بیان کرتے ہیں:

> مرتضٰی بیگ اپنے والد کے افغانی جہاد کے کارناموں کے بارے میں لکھی گئی کتابوں کو پڑھتے پڑھتے جوان ہوا تھا....ان کتابوں کی اشاعت پر خاص رقم صرف ہوتی تھی اور اُنہیں ملک کی اہم ہستیوں اور چیدہ کالم نگاروں کو تحفے کے طور پر بھیجا جاتا تھا(۱۲)

مرتضٰی بیگ چونکہ ایک مجاہد کا بیٹا تھا،جو بعد میں ایک صنعت کار بھی بن گیا تھا۔اس لیے مرتضٰی بیگ کو زندگی کی تمام سہولیات حاصل تھیں،بلکہ اُن کی زندگی بہت زیادہ رنگین تھی۔مرتضٰی بیگ چونکہ ایک مجاہد اور صنعت کار کا بیٹا تھا،اس لیے اس کے نظریات اور طالبان میں شامل ہونے کی وجوہات ذاتیں تھیں۔وہ اکثر لندن جایا کرتا تھا۔اس کی زندگی کا نقشہ مستنصر حسین تارڑ ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

> کراؤن پرنس بھی اکثر اسی حالت میں ہوتا جس حالت میں قبلہ والد صاحب ہوتے...شہر کے تمام ریستوران،پرائیویٹ شکار گاہیں اور گھرانے کے فارم ہاوس اُس کی زد میں تھے،کیونکہ ایک تو وہ ایک نامور مجاہد اور صنعت کار کا بیٹا تھا اور دوسرے وہ ہر دو چار ہفتوں کے بعد ایک نئی سنی پٹرول میں سے اترتا۔اگرچہ لنڈن اور پیرس میں بھی کچھ معمولی سی رہائش گاہیں تھیں اور وہاں آتا جاتا رہتا تھا،لیکن زندگی کا جو بے حساب اور بے انصاف لطف یہاں تھا وہاں نہ تھا...ان غیر ملکی

رہائش گاہوں میں کل وقتی ملازم رکھنا وہ افورڈ نہیں کر سکتے تھے اور ناشتہ خود بنا پڑتا تھا۔(۱۳)

جس طرح اللہ بخش ایک بونے کے کہنے پر جہاد میں شامل ہوا، اسی طرح مرتضٰی بیگ ایک نائی گلو خان سے ملنے کے بعد اور ان کی باتوں سے متاثر ہو کر ان کے ساتھ افغانستان پہنچا۔ گلو نائی بھی ایک پڑھا لکھا شخص تھا، مغربی موسیقی کا رسیا، اور صرف نفیس لباس زیب تن کرتا، مذہب سے کوسوں دور، تازہ ترین انڈین گانوں، کرکٹ میچوں اور فلمی سکنڈلز میں دلچسپی رکھنے والا شخص تھا، پھر اچانک اس کے اندر ایک بڑی تبدیلی آ گئی۔ نائی گلو کی باتوں سے متاثر ہو کر مرتضٰی بیگ بھی افغانستان پہنچا، جہاں، بقول گلو کے جنت بٹ رہی تھی۔ اس لیے مرتضٰی بیگ بھی ایک نہ سمجھ آنے والی صورتِ حال کو سمجھنے کے لیے افغانستان جا پہنچا۔ مستنصر حسین تارڑ بیان کرتے ہیں:

> صرف ایک نہ سمجھ آنے والی صورتِ حال کو سمجھنے کے لیے ...ایک تجسس کی خاطر ایک نئے نشے کا تجربہ کرنے کے لیے، اپنے والدین سے یہ کہہ کر کہ وہ چند دوستوں کے ہمراہ بوٹ کلب کراچی میں چند روز گزارنے جا رہا ہے وہ گلو خان کے ہمراہ علاقہ غیر میں ایک جہادی کیمپ میں جا پہنچا...(۱۴)

جہادی کیمپ میں مرتضٰی بیگ مختلف لوگوں سے ملاقات کرتا ہے، یہاں کی دنیا اور تھی۔ پانچ وقت کی نماز، تسبیح، واعظ، اللہ رسول کی باتیں، قران کی تعلیمات، اور ان کے ساتھ ساتھ جہاد کی تعلیم اور ہتھیاروں کے استعمال کی تربیت۔ اس دنیا میں اب مرتضٰی بیگ کو مزا آنے لگا تھا۔ وہ اپنی پہلی زندگی کا کفارہ ادا کرنا چاہتا تھا، اُس زندگی کا کفارہ جہاں وہ سیف ہاوس میں حسین ترین عورتوں کی ناف کو سکڑتے لچکتے دیکھ کر لطف لیا کرتا اور ایک راحت بھری رات گزارتا تھا۔ وہ اس زندگی کا کفارہ ادا کرنے کے لیے جہادی کیمپ میں شامل ہو گیا۔ ٹریننگ حاصل کرنے کے بعد اُس کو قندوز میں بھیج دیا گیا۔ مستنصر حسین تارڑ لکھتے ہیں:

> قندوز میں مرتضٰی بیگ تھا....ایک ایسا شہر جس کے نام سے بھی وہ ناواقف تھا۔ اور وہ ایک کلاشنکوف سنبھالے ایک گہری کھائی میں چھپا کئی روز کی نقاہت اور بھوک سے نڈھال ان دیکھے دشمن پر بے تحاشا فائر کر رہا تھا...لاشوں کے انبار میں

پھنسا ہوا فائر کر رہا تھا۔(۱۵)

اس تہہ خانے کے اندر مرتضٰی بیگ تیسرے نمبر پر آیا تھا۔ چونکہ وہ ایک فوجی کا بیٹا تھا اس لیے وہ جنگ کی تمام حکمت عملیوں سے واقف تھا۔ جب مرتضٰی بیگ ایک ریوڑ کے ہمراہ قلعہ جنگی میں اترا تو اُس نے دیکھ لیا تھا کہ صحن کے مغربی کونے میں چند کوٹھڑیاں ہیں اور اُن کے فرش کے برابر کچھ سیڑھیاں نیچے جا رہی ہیں۔ جب شمال والے اُن کو بھون رہے تھے اُن پر گولیوں کی بوچھاڑ کی جا رہی تھی تو ایک ڈیزی کٹر کا دھاکہ ہوا تو وہ اس تہہ خانے کی طرف دوڑ کر یہاں آ پہنچا۔ مستنصر حسین تارڑ لکھتے ہیں:

> میں ایک فوجی کا بیٹا ہوں اور جنگ کی تمام حکمت عملی سے واقف ہوں کہ تم جہاں کہیں بھی ہو اپنی پوزیشن کا تعین کر کے فرار کے رستے کا بھی تعین کر لو، جب وہ ہمیں مزار شریف سے ایک ریوڑ کی صورت میں ہانکتے ہوئے ادھر قلعہ جنگی کے احاطے میں لے آئے تھے تو میں نے یہاں داخل ہوتے ہی یہ دیکھ لیا تھا کہ وسیع کچے صحن کے مغربی کونے میں چند کوٹھڑیاں ہیں اور ان کے فرش کے برابر میں کچھ سیڑھیاں نیچے جا رہی ہیں ...جب شمال والے ہمیں بھون رہے تھے اور جب پہلے ڈیزی کٹر نے صحن میں ایک آتش فشاں کی مانند گڑھا بنایا تو میں اندھا دھند ان سیڑھیوں کی طرف بھاگا ...لیکن اس سے پیشتر میں نے ایک زخمی کے شکنجے میں کسی ہوئی کلاشنکوف کھینچی اور اسے فائر کرتا ہوا یہاں اتر آیا ... پہلے تو گھپ اندھیرا تھا اور پھر یکدم مجھے دو ہیولے دکھائی دیے اور میں انہیں شوٹ کرنے کو تھا کہ میں نے سنا کی ان میں سے ایک ...کلمہ پڑھ رہا تھا تو میں رک گیا۔(۱۶)

چونکہ مرتضٰی بیگ ان سب سے بڑا ہے اس لیے وہ اپنے تمام مجاہدین کا بہت خیال رکھتا ہے۔ جس طرح ایک باپ اپنے بیٹوں کا خیال رکھتا ہے اسی طرح مرتضٰی بیگ بھی ان کا خیال رکھتا تھا کہ کون کس حالت میں ہے۔ مستنصر حسین تارڑ لکھتے ہیں:

> مرتضٰی بیگ عمر میں اُن سب سے بڑا تھا ...کم از کم دس برس بڑا تھا، اسی لیے اپنے آپ کو اُن سب کے لیے ذمہ دار سمجھتا تھا ...اُن سے کہیں زیادہ نقاہت کا مارا ہوا

اور نڈھال تھا اور بچوں کی طرح انہیں ڈانٹتا بھی تھا اور اُن کا خیال بھی رکھتا تھا وہ
بمشکل اٹھا اور ہاشم کے پاس جا بیٹھا... ہاشم ...ہمت کرو۔ (۱۷)

مرتضٰی بیگ بھی اب اس تہہ خانے میں انتہائی زخمی حالت میں ہے، وہ بھی دوسرے کرداروں کی طرح اس تہہ خانے سے باہر نہیں جا سکتا۔ کیونکہ اوپر سے کسی بی باون کا عتاب نازل ہوسکتا ہے، اگر اوپر سے کوئی کروز میزائل نہ آیا تو پھر شمال والوں کی نظر پڑسکتی ہے۔ مرتضٰی بیگ کو بھی اب اپنی موت کا یقین مستحکم ہو چکا ہے اور مرنے کے قریب ہے، لیکن مرنے سے پہلے مرتضٰی بیگ بھی اپنی ماضی میں جا کر آئس کریم اور زنگر برگر کو یاد کرتا ہے:

مجھے میکڈانلڈ کا زنگر برگر اور آئس کریم یاد آتی ہے ...واقعی گھوڑے کا گوشت جہاں
بدن کو گرم کرتا ہے وہاں خشکی بھی پیدا کرتا ہے تو اس کریمی آئس کریم کے دو چمچے
اس وقت مل جائیں ناں...(۱۸)

مرتضٰی بیگ کو مرنے سے پہلے اب اپنی غلطی کا بھی احساس ہو جاتا ہے۔ اب وہ کسی کے لیے نہیں صرف اپنی بقاء کی جنگ لڑ رہا تھا۔ اُن کو یہ بات سمجھ آ گئی تھی کہ صلیبی جنگوں سے لے کر سوویت یونین اور 9/11 تک صرف ایک بہانہ بنا کر بہت سے لوگوں کو اپنے مفاد کے لیے استعمال کیا گیا۔

قلعہ جنگی کا چوتھا اہم کردار ہاشم میر ہے۔ ان کا تعلق برطانیہ سے ہے۔ اُن کی پیدائش برطانیہ کی تھی اگر چہ اُن کے والد پاکستانی تھے اور کسی طرح سمگل ہو کر برطانیہ جا پہنچا۔ ہاشم میر اپنے والد کو ایک عجیب و غریب ذہنیت کا عادی مجرم گردانتا ہے، اس لیے وہ اپنے باپ پر بھر پور تنقید کرتا ہے۔ تو اُس کی ماں اُس کو سختی سے منع کر دیتی ہے۔ یہ اُن کی ماں کی وفاداری تھی، وہ کہتی تھی کہ وہ جو کچھ بھی کر رہا ہے صرف اور صرف ہمارے اچھے مستقبل کے لیے کر رہا ہے۔

ہاشم میر کے ماں باپ دونوں ان پڑھ تھے۔ وہ غیر قانونی طور پر سمگل ہوا تھا۔ وہ برطانیہ کی تمام ویل فیر این جی اوز سے چیک وصول کرنا اپنا حق سمجھتا ہے، بلکہ اس پر فخر بھی کرتا ہے۔ اُن کا نعرہ ہے کہ اگر گنجائش ہو اور فائدہ نہ اٹھایا جائے تو انسان کی کم عقلی کے سوا کچھ نہیں ہے اور ہاشم میر کی ماں اُن کو حق بجانب سمجھتی ہیں۔

ہاشم میر کے والد پرانی چیزوں کو گھر لاتا ہے۔جن کو انگریز لوگ ناکارہ سمجھ کر پھنک دیتے ہیں، یہ خوبی بھی ان کے والد میں موجود تھی۔اس لیے ان کا سارا گھر ایک پرانی وضع کا تھا۔وہ انگریزوں کی عقل پر تنقید کرتا ہے کہ یہ انگریز لوگ اچھی بھلی چیزوں کو اٹھا کر گھر سے باہر پھنک دیتے ہیں۔اس کا والد پانچ وقت کا نمازی ہے لیکن گوری عورتوں سے ہم بستری کرنے کا موقع بھی ہاتھ سے نہ جانے دیتا۔اس کے والد نے ہاشم میر کو اپنی سگی بہن سے ملنے سے بھی منع کر رکھا تھا چونکہ وہ اپنے شوہر کی روزانہ کی مار پیٹ سے تنگ آ کر اُسے چھوڑ کر اپنی زندگی خود سے جینے لگی تھی اور اس لیے ایک شراب خانے میں ویٹریس کے طور پر کام کرنے لگ گئی۔اُس کے والد کا کہنا تھا کہ وہ اُن سے نہ ملے چونکہ اُس نے خاندان کا نام بدنام کیا ہے

ہاشم میر چونکہ برطانوی ماحول کا عادی تھا، برطانوی ماحول میں پلا بڑھا تھا اس لیے اُس کے اندر برطانوی خصوصیات کا پیدا ہونا کوئی بڑی بات نہ تھی۔اُس کا ذہن برطانوی سوچ کا حامل تھا۔وہ اپنے باپ کی سطحی ذہنیت سے اکتا چکا تھا۔حالانکہ اُس کے والد نے اُن کی تعلیم پر خوب پیسا لگایا تھا،اُس کو کبھی مارا پیٹا بھی نہ تھا۔ بلکہ اُس کی تمام ضروریات کا خیال رکھتا۔ہاشم میر مذہب سے دور ایک روشن خیال آدمی تھا۔اُس کا والد اکثر اُس کو اسلام کی باتیں بتاتا،جب کبھی کوئی بڑا مولوی پاکستان سے یہاں آتا وہ اُن سے بھی اپنے بیٹے کی ملاقات کرواتا تا کہ اُس کو اسلام کی تعلیمات کی سمجھ آ جائے۔وہ اسلام کے بنیادی اصولوں کو جان سکے۔لیکن اُس کا والد اُن کو جس قدر مذہب کی طرف دھکیلتا وہ اتنا ہی مذہب سے بھاگتا۔وہ جدید تعلیم حاصل کر رہا تھا۔یہ کردار اپنی کہانی بیان کرتے ہوئے کہتا ہے:

> اے لیولز میں پانچ ایز حاصل کرنے پر مجھے لنڈن سکول آف اکنامکس میں داخلہ مل گیا اور میں بریڈفورڈ چھوڑ کر لندن شفٹ کر گیا...یہ پہلی بار تھا کہ مجھے لنڈن میں باقاعدہ قیام کرنے کا موقع ملا تھا...اگرچہ میں بریڈفورڈ میں بھی باقاعدگی سے مسجد جایا کرتا تھا۔اور سکول کے بعد وہاں سے میں ایک میرپوری مولوی صاحب سے قران پاک کی تعلیم بھی حاصل کی تھی...لیکن میں کبھی بھی مذہب کی جانب راغب نہیں ہوا تھا۔(۱۹)

ہاشم میر بھی اپنے ایک دوست کے کہنے پر اس جہاد میں شامل ہوا تھا۔ہاشم میر سکول کے ایک ہم جماعت سعودی

لڑکے ال منصور کی باتوں سے متاثر ہو کر افغانستان پہنچا تھا۔اُن کی ملاقات ایک اسلامی سنٹر میں ہوئی تھی اُس دن ہی ال منصور نے ہاشم کو اسلام کے تصور سے آگاہ کیا تھا۔ یہ مجاہد اپنی کہانی بیان کرتے ہوئے کہتا ہے:

> یہ ال منصور تھا جو مجھے یہاں لے کر آیا....اُس نے مجھے اسلام کے اُس تصور سے آگاہ کیا تھا جس کی وسعت ...کائناتی سچائی اور فراخدلی میرے گمان میں بھی نہ تھی ...جس کی رحمت اور محبت کے بارے میں آج تک مجھے کسی نے نہیں بتایا تھا...میں اِسے صرف خوف اور عذاب سمجھتا رہا تھا ایک ناقابلِ عمل عقیدہ سمجھتا رہا تھا...وہ مجھے سامنے بیٹھا کر قران پڑھتا اور پھر انگریزی میں اُس کی تفسیر کرتا تو مجھے ایسی دنیائیں دکھائی دینے لگتی جو آج تک میری نظروں سے اوجھل تھیں اور میں اُن کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔(۲۰)

یہ ال منصور تھا جس نے ہاشم میر کو یہ تصور کامل دیا تھا، وہ افغانستان میں اپنے فرض ادا کرنے آیا تھا۔ایک مقصد کو پورا کرنے ،لیکن اگر وہ اپنے باپ کو پرکھ سکتا تھا تو اپنے ہمراہ لوگوں کو بھی پرکھ سکتا تھا۔ہاشم میر نے یہ تو نہیں بتایا تھا کہ وہ اس تہہ خانے میں کس طرح آیا تھا۔لیکن اب وہ اسی تہہ خانے کے اندر زخمی حالت میں ہے اس لیے جب مرتضٰی بیگ اُس کو گھوڑا پکڑنے کے لیے کہتا ہے تو یہ جواب دیتا ہے

> مجھ میں سکت نہیں مرتضٰی بیگ ...میرا بازو بہت سوج گیا ہے ...اس میں ٹوٹی ہوئی ہڈیوں کی کرچیاں ہیں اور وہ ذرا سی بھی حرکت کرتا ہوں تو میرے گوشت میں کھبتی چیخیں نکال دیتی ہیں ...ہلا نہیں جاتا۔(۲۱)

اس کے بعد ہاشم میر غنودگی میں چلا جاتا ہے،تو اُس کے ساتھی اُس کو جھنجوڑ کر واپس ہوش میں لانے کی کوشش کرتے ہیں ۔وہ ہوش میں آجاتا ہے وہ پہلے بھی شاید ہوش میں تھا۔وہ بھی دوسرے ساتھیوں کی طرح خیال ہی خیال میں اپنے گھر جا چکا تھا،اُن کو اپنی ماں یاد آرہی تھی ۔ہاشم میر کہتا ہے:

> میں پھر سے گھر جانا چاہتا ہوں ...میں گھر میں تھا اور تم نے مجھے جگا دیا...میرے کمرے میں گیس کا ہیٹر جل رہا تھا اور میرے بدن کے ایک ایک روئیں میں اُس کی گرمی اترتی تھی اور مجھے سکھی کرتی تھی اور تم نے مجھے جگا دیا...اب میں پھر سے

سرد ہونے لگا ہوں ...مجھے سونے دو۔(۲۲)

دوسرے مجاہدوں کی طرح ہاشم میر بھی زخمی حالت میں اس تہہ خانے کے اندر اپنے ماضی کو یاد کرتا ہے، کہ 9/11 سے پہلے اُن کی زندگی کتنی اچھی بسر ہو رہی تھی اور وہ ال منصور کے کہنے پر یہاں آ گیا تھا۔ یہاں وہ اپنے مقصد کو پورا کرنے آیا تھا۔ اُس نے بھی کائناتی سچائی جاننے کے لیے افغانستان کا سفر اختیار کیا تھا۔ یہ تھوڑی دیر کی یادیں ہیں جن کو ہاشم میر بار بار یاد کر رہا ہے وہ خیالوں میں اپنے گھر جاتا ہے، وہ بریڈفورڈ کو یاد کرتا ہے۔ دوسرے مجاہدوں کی باتیں سن کر ہاشم میر بھی اپنے ماضی کو یوں بیان کرتا ہے

> ہاشم نے کروٹ بدلی ...اپنا کان ادھر کیا جدھر سے یہ آوازیں آ رہی تھی، مسلسل اس کے کانوں میں اتر رہی تھیں اور وہ بھی ہنسا ...بریڈفورڈ کی سرد راتوں میں فش اینڈ چپس کھانے کا بھی اپنا لطف ہے ...لیکن ماں کے ہاتھوں کے باریک گرم گرم پھلکے اور گھنے تہہ دار پراٹھے ...کبھی قیمے کے اور کبھی مولی کے۔(۲۳)

یہ ہاشم میر کی زندگی کے شخصی ارتقاء پر 9/11 کے اثرات کی کہانی تھی جو بیان کی گئی ہے کہ کس طرح وہ ایک پُر آسائش امن کی زندگی کو ترک کر کے اس تہہ خانے میں پہنچ گیا۔

قلعہ جنگی کا پانچوں اہم کردار ایک پٹھان گل شیر ولی ہے۔ اس کا تعلق پاکستان کے قبائلی علاقہ دِیر سے ہے۔ دِیر میں ان کے والد ایک نواب کے اصطبل میں گھوڑوں کی لید صاف کیا کرتا تھا۔ دِیر کے نواب کے پاس بہت زیادہ روپیہ تھا، گھوڑے تھے، گاڑیاں تھیں۔ جب دِیر کے نواب نے اپنے ایک کتے کی شادی کی تھی تو پورے دِیر کو روٹی اور گوشت کھلایا تھا۔ گل شیر نے زندگی مین پہلی دفعہ یہاں پیٹ بھر کر کھانا کھایا تھا۔ اس لیے گل شیر کی خواہش تھی کہ کاش نواب روز اپنے کتوں کی شادی کرتا رہے تاکہ روزانہ گوشت روٹی نصیب ہوتی رہے۔

گل شیر کو اپنے بچپن میں اس بات کا بھی علم نہ تھا کہ یہ جو اللہ نے دو پاؤں دیے ہیں ان میں بھی کچھ پہنا جاتا ہے۔ وہ ننگا پاؤں بوجھ ڈھوتا تھا جس کی وجہ سے اس کا پاؤں اُس کی طرح بڑا سا ہو گیا تھا۔ اس کے تلوے میں ڈراڑیں پڑ گئیں تھی۔ اس وقت اس کی عمر کوئی چھ سات برس ہو گی جب اس کے پاؤں میں ایک کیڑے نے گھر بنالیا تھا اور وہ اسی طرح اصطبل میں بھی کام کرنے کے لیے جایا کرتا تھا۔ اصطبل میں کام کرنے

کی نوعیت کو اس طرح بیان کرتے ہیں :

یارا ادھر جتنا بھی گھوڑا تھا اور بہت زیادہ تھا...وہ مجھے لگتا تھا کہ عام گھوڑوں کی نسبت زیادہ لید کرتا تھا، زیادہ پیشاب کرتا تھا...اور بہت گھوڑا تھا....بے وفا اور ذلیل جانور ہے یارا... پورا رات صفائی کرتا تھا، پھر بھی لید ختم نہیں ہوتا تھا...اصطبل کے آخر تک صفائی کرتا تھا تو پچھلے والا حرامی گھوڑا پھر لید کر دیتا تھا...جھاڑو ٹوٹ جاتا تھا تو پھر ہاتھ سے اسے صاف کرتا تھا...ہفتے میں صرف ایک جھاڑو کا اجازت تھا...وہ ٹوٹ جاتا تو پھر اور کیا کرتا... ہاتھ سے کرتا۔(۲۴)

9/11 سے پہلے گل شیر کے گھر میں غربت تھی ،بھوک پیاس تھی ۔پورا گھر غربت میں جکڑا ہوا تھا۔ وہ کل چھ بہن بھائی تھے ۔دو بہنیں تھیں جن کو اُن کی ماں نے شادی کے لیے بیچ دیا تھا تا کہ پیٹ میں چند دن روٹیاں ڈال سکیں ،ان کا ایک بھائی کراچی جا کر چوکیدار ہو گیا تھا ۔دوسرا بھائی لاہور میں دانے کی بھٹی دھکیلتا۔تیسرا بھائی ماں کی گود میں رہتا تھا، وہ ماں کا لاڈلا تھا گود میں ہی مر گیا۔

ان کا والد بھی اسی اصطبل میں کام کرتا تھا ۔لیکن ایک دفعہ وہ اپنے نواب کے گھوڑے پر بیٹھ گیا تو اصطبل کے منشی نے نواب کو شکایت کردی کہ وہ آپ کے گھوڑے پر بیٹھتا ہے ۔نواب کو اس بات پر بڑا غصہ آیا اور اس کی سزا یوں دی کہ پہلے تو اُس نے خود گل شیر کے والد کو گھوڑا بننے کو کہا اور خود اس پر سوار ہو کر کوڑے بھی مارنے لگا۔ اس طرح گل شیر کے والد نے نواب کو اپنے اوپر بٹھا کر پورے میدان کا چکر لگایا اور اس کے بعد اس کو نوکری سے نکال دیا۔اس طرح گھر میں جو تھوڑا بہت روپیہ آتا تھا وہ بھی بند ہو گیا۔

پھر ایک دفعہ دِیر کے ساتھ سوات کی ریاست میں ایک مولوی آ گیا ، جو چند دن میں ہی مشہور ہو گیا۔ سوات میں آ کر اُس نے درہ مالاکنڈ بند کر دیا کہ یا تو شریعت ہو گا یا شہادت ۔مولوی کی تقریر سن کر وہ بھی اس کا مرید ہو گیا ۔گل شیر دلی مولوی کی دلیلوں سے بہت زیادہ متاثر ہوا۔مولوی کہتا تھا کہ ہمیں پاکستان میں اسلام چاہیے ، بے شک پاکستان پر ہندوستان قبضہ کرے تو اچھا ہی ہو گا ، چونکہ اس طرح وہاں کا مسلمان بھی انڈیا کے خلاف جہاد کے لیے اٹھ کھڑا ہو گا تو اس طرح ہندوستان کے بھی ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے ۔وہ مولوی کی ایسی دلیلوں سے بہت زیادہ متاثر ہوتا اور اُس کی ذہانت پر حیران ہوتا تھا ،اس طرح مولوی کی باتوں سے متاثر ہو کر

وہ مدرسے چلا گیا۔ جہاں آ کر اُن کو بہت سی سہولیات میسر آ گئی۔ وہ بیان کرتا ہے:

ادھر کھانا ملتا تھا، کپڑا ملتا تھا، اور شہادت کی برکات پر تقریر ملتا تھا...مولوی ہم سے کہتا تھا کہ وہ مسلمان نہیں جو طالبان کی مدد نہ کرے... یارا ہمارے پاس تو اور کچھ تھا نہیں صرف مسلمانی تھا تو اسے ضایع نہیں کرنا تھا...امریکہ نے جنگ شروع کیا تو مولوی نے لشکر بنایا...کیا جذبہ تھا یارا...اس نے دس ہزار مجاہد تیار کیا۔ جس میں بہت ہمارا بوڑھا کی طرح کا بھی تھا لیکن باقی لوگ ہمارے موافق جوان لوگ تھا ...بھوک پیاس اور نیند ختم ہو گیا ہم دن رات ایسا نعرہ لگاتا تھا کہ گلا بیٹھ گیا ۔ ہمارے پاس ہتھیار تو بہت تھا مگر کم ہو گیا تو مولوی نے کہا تم لوگ مومن ہو تلوار سے جہاد کرے گا۔ (۲۵)

مدرسے میں آنے سے پہلے ان کے گھر کا یہ حال تھا کہ ان کے گھر میں نہانے کے لیے صابن بھی نہ تھا، جبکہ نواب کے گھوڑے اور کتے کو صابن سے نہلایا جاتا تھا گل شیر کہتا ہے:

اصطبل میں اپنا بوڑھا...اپنا والد لوگ نواب کے گھوڑا لوگ کی لید صاف کرتا تھا اور ان کو غسل دیتا تھا...انہیں ستھرا کرنے کے واسطے صابن لگاتا تھا...خود ہمارے گھر میں کبھی صابن نہیں آیا، میرا بوڑھا والد مجھے بولتا تھا کہ صابن صرف گھوڑا اور کتے کو نہانے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ انسان کے لیے نہیں ...بعد میں بڑا ہو کر معلوم ہوا جھوٹ بولتا تھا، ہمارے پاس پیسہ نہیں تھا صابن خریدنے کو... یارا ہم مدرسہ گیا تو ادھر ہم کو صابن بھی ملا۔ (۲۶)

امریکہ نے افغانستان پر حملہ کر دیا تو قندوز میں بہت لوگ شہید ہو گئے ۔ ان میں تلوار والے جتنے بھی مردِ مومن تھے سب شہید ہو گئے ۔ وہ اپنے اپنے خندقوں میں نعرے لگاتے ۔ لیکن جیسے ہی کوئی خندق سے باہر آتا تو وہ واپس خندق میں آ کر گرتا تھا ۔ مولوی تو اپنا بیٹا اور رشتہ داروں کو ساتھ لے کر ، باقی لوگوں کو وہی چھوڑ کر جانے کہاں نکل گیا تھا۔ بعد میں بھی اس کا کچھ پتا نہیں چلا ۔ گل شیر کہتا ہے

یارا ہم کیا کرتا...اوپر سے بم گرتا تھا...ہمارے سے بہت دور گرتا تھا تو ادھر ہمارے

کان اور منہ سے خون نکلنے لگتا۔اتنے زور کا دھاکہ کرتا تھا...سامنے سے اتنی گولی
آتا تھا کہ ہم سر اٹھاتا تھا تو اس میں لگتا تھا...ہم کیا کرتا...ہتھیار ڈال دیا۔(۲۷)

اس طرح گل شیر ولی قلعہ جنگی کے اس تہہ خانے میں پہنچ گیا جو لاشوں سے بھرا پڑا ہے، بدبو ہے اور انسانی اعضاء بکھرے پڑے ہیں۔گل شیر ولی شہادت کا جذبہ لے کر جہاد میں شامل ہوا تھا۔اس کے علاوہ اُس کو کسی اور چیز کی فکر نہ تھی،ایک مولوی کی باتوں سے متاثر ہو کر جہاد شروع کیا تھا۔لیکن اب انتہائی زخمی اور بری حالت میں اس تہہ خانے کے اندر ہے۔یہاں سے نکل کر وہ کہیں بھی نہیں جا سکتا،موت اُن کا مقدر بن گئی ہے۔باہر نکلے تو بم آکر گرتا ہے اور اس سے بچ جائے تو شمالی اتحاد والے ان کا پیچا کرتے ہیں۔اس لحاظ سے وہ ایک تہہ خانے میں نہیں بلکہ قبرستان میں ہی ہے۔مرتضٰی بیگ کو اپنی حالت زار یوں بیان کرتا ہیں:

تم پر تو دل و جان قربان کردیں مرتضٰی... پر کیا کریں جان بہت اذیت میں پڑا ہے...اُس مادر چوڈیزی کٹر بم کا زہر آلود ٹکڑا میرے معدے کے آس پاس جا کر کہیں ٹھہر گیا ہے اور میرے پاخانے کا نکاس نہیں ہو رہا یارا...اور میں پچھلے تین دن سے وہ سب کچھ اپنے اندر لیے بیٹھا ہوں جو باہر آنا ہوتا ہے۔اور وہ نہیں آرہا غلاظت کو سنبھالے بیٹھا ہوں یارا...باقی زخم وخم کا تو خیر ہے پر یہ عجیب خانہ خراب مصیبت لگا ہے۔گھوڑا کھائے گا تو اور بوجھ پڑے گا،لیکن چلے گا تمہارے ساتھ۔(۲۸)

اب اسی تہہ خانے کے اندر گل شیر ولی اپنے دِیر کے مالٹوں کو یاد کرتا ہے۔کیونکہ گھوڑے کے گوشت نے اُن کے اندر گرمی پیدا کردی تھی۔اس لیے دِیر کے مالٹے کا رس یاد کرتا ہے کہ کس طرح وہ حلق کو تر کرتا تھا۔ اس دِیر کے مالٹے کے ساتھ اپنی موت کا بھی انتظار کر رہا ہے،کیونکہ وہ تو شہادت کے شوق سے آیا تھا اور ایک دھماکے کے بعد اِن کی یہ خواہش پوری ہو جاتی ہے۔

ناول کا چھٹا کردار عبدالحمید جان واکر ہے۔ان کا تعلق امریکہ سے ہے جانی کو گھوڑا رکھنے کا بہت شوق تھا،امریکہ میں بھی اس کے پاس ایک پونی نام کا گھوڑا تھا۔لیکن پھر اس کے اندر یہ تبدیلی رونماں ہوتی ہے کہ وہ کیمونزم کے خلاف ہو جاتا ہے اور اس حوالے سے اپنے والد سے بحث ومباحثہ کرتا ہے۔اس کے والد کا کہنا

ہے کہ تمہارے پاس کوئی تصورِ کامل نہیں ہے۔ یہ پونی براونی گھوڑا تو میں نے صرف تمہارے شوق کے لیے دیا تھا۔ لیکن صرف گھوڑا رکھنا ہی تو تصورِ کامل نہیں ہے۔ ہمارے لیے تو سوشلزم ہی ایسا تصورِ کامل تھا جو ہماری زندگیوں کو وقعت دیتا تھا۔ ہمارا مقصد تو یہ تھا کہ جو صدیوں سے بوسیدہ نظام چلا آرہا ہے اس کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا جائے۔ اس میں انسانیت کی بھلائی ہے ہمارا مقصد تو عام آدمی، غریب، کسان، اور مزدوروں کو عزتِ نفس دینا اور اُن کی حکمرانی قائم کرنا تھی۔

اس کا جواب عبدالحمید جان واکرعرف جانی یہ دیتا ہے کہ کیا اتنے سارے لوگوں کو اپنے آبائی وطن سے بے دخل کر کے، بہت سارے لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار کر کیا آپ لوگوں کا خواب اور تصورِ کامل پورا ہو چکا ہے۔ کیونکہ جہاں پہلے پارٹی پروپوگنڈے کے پمفلٹ اور کتابچے چھپتے تھے اب وہاں اُن کی جگہ پورنوگرافک میگزین اور گلیمرس جرائد چھپتے ہیں تو کیا یہی آپ لوگوں کی آزادی تھی۔ گلیوں میں بھکاریوں کی تعداد میں کیوں اضافہ ہو گیا، آپ لوگوں نے اتنے سارے لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔

9/11 سے پہلے عبدالحمید جان واکر سب سے پہلے کمیونزم کے خلاف بولنا شروع ہوا۔ ان کے پاس دنیا کی ہر سہولت موجود تھی، ایک پونی گھوڑا تھا، ایک سپورٹس کار جس میں اکثر ایک بدن بھرے اور لمبی ٹانگوں والی اس کی گرلز فرینڈ بیٹھی ہوتی۔ اس کے پاس بہترین شراب اور ہیروئن میسر ہوتی تھی۔

لیکن ان کا دل اندر سے مطمئن نہ تھا اور پھر ایک دن اُس نے اپنے والد سے کہا کہ اُس نے اپنا آبائی عقیدہ چھوڑ دیا ہے اور اسلام قبول کرلیا ہے۔ یہ بات اُس کے والد کے لیے سب سے حیران کن تھی۔ مستنصر حسین تارڑ بیان کرتے ہیں

> لیکن تصورِ کامل پر اتنی شدت سے یقین رکھنے والا باپ بھی ایک لمحے کے لیے
> سناٹے میں آ گیا جب ایک روز جانی نے اُسے بتایا کہ اُس نے اپنا آبائی عقیدہ
> تبدیل کرلیا ہے ... مسلمان ہو گیا ہے اور عربی سیکھنے یمن جا رہا ہے۔ (۲۹)

عبدالحمید جان اس بات کا قائل ہو چکا تھا کہ اسلام مذہب میں مجھے ایک تصورِ کامل دکھائی دیتا ہے، کہ پوری دنیا میں جہاں بدی کی قوتیں ہیں اُن کے خلاف جہاد کیا جائے۔ یہی ایک ایسا نظامِ حیات ہے جس میں عقیدے کے ساتھ مطابقت پائی جاتی ہے۔ آخر عبدالحمید نے طالبان کا ساتھ دینے کا فیصلہ کرلیا۔ عبدالحمید

مذہب کے عقیدوں کا موازنہ کرتے ہوئے اپنے والد سے کہتا ہے:

لیکن یہ ساکن عقیدے ہیں اور اسلام متحرک ہے۔ آپ اپنا لیکچر بھول گئے ہیں کہ ...امید کرنے والے غیر متحرک نہیں ہو سکتے ...میں طالبان کا ساتھ دینا چاہتا ہوں۔(۳۰)

جب اُس کے والد کو یہ پتا چلتا ہے کہ وہ طالبان کا ساتھ دینا چاہتے ہیں تو اُس کے والد نے کہا کہ تم اُن جاہل اور وحشی ملاؤں کا ساتھ دینے جا رہے ہو، جنہوں نے افغانستان کو پتھر کے زمانے میں پہنچا دیا ہے۔ جہاں ہر کام حرام ہے، رباب بجانا حرام ہے، کھلاڑیوں کا نیکر پہن کر کھیلنا حرام ہے۔ اُن لوگوں نے عورتوں کو برقعے میں دفن کر دیا ہے۔ بچیاں سکول نہیں جا سکتی۔ ایسے ملاؤں میں جانا چاہتے ہو۔ لیکن یہ ساری دلیلیں عبدالحمید جان کے لیے بے کار تھیں اُن کا کہنا تھا کہ اُن پر سو الزام ٹھیک لیکن ان لوگوں میں کھوٹ نہیں اُن کے اندر کرپشن نہیں۔ دنیا کی بہت کم ریاستیں اُن لوگوں کو صرف اس لیے پسند نہیں کرتیں کہ اُن کی موجودگی میں موازنہ ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے بہت سے چہرے بے نقاب ہو جاتے ہیں

عبدالحمید نے طالبان کا مکمل ساتھ دینے کا فیصلہ کرلیا۔ لیکن افغانستان کی اندرونی صورتِ حال سے بے خبر افغانستان جا پہنچا۔ یہ بات حیران کن ہے کہ ایک امریکی شہری جس کو دنیا کی ہر سہولت حاصل تھی اور امریکہ جیسے ملک کو چھوڑ کر افغانستان جا پہنچا اور طالبان کا ساتھی ہو گیا۔ عبدالحمید نے بھی شمال والوں کی گولیوں اور امریکی بمباری سے بچنے کے لیے اس تہہ خانے میں پناہ لی۔ عبدالحمید اپنے بارے میں کہتا ہے:

میں... جانی بڑ بڑانے لگا جب بی۔52 کے کلسٹر بم اترے اور بہت اوپر فضا میں پھٹے اور پھر ان میں سے سینکڑوں چھوٹے چھوٹے بم ایک گلاس جتنے ہم پر برسنے لگے...میرے بدن پر اتنے لوتھڑے...دوسروں کے لوتھڑے چپکے ہوئے تھے کہ اُن سے ایک اور بدن بنایا جا سکتا تھا۔ جانے کس کس کے اور کون کون سے اعضاء اڑتے ہوئے میرے جسم کے ساتھ آ لگے تھے...اور ابھی تک گرم تھے تو میں پہلے موت اور پاگل پن کے سناٹے اور قہر میں آیا ہوا قلعہ جنگی کے صحن سے فرار ہونے کی بجائے وہیں کھڑا منہ اٹھا کر اپنے ہم وطنوں کو گالیاں دینے لگا۔ یو بلڈی

راسکلز... یوسن آف بچز... لیکن وہ بہت بلندی پر تھے... پھر ایک چھوٹا بم میرے
قریب پھٹا۔ میری ناک میں سے خون بہنے لگا اور اسکی کرچیاں میری ٹانگوں میں
چھید کر گئیں اور میں لنگڑاتا ہوا بھاگنے لگا... فصیل کی جانب ...ادھر شمال کی گولیاں
اور راکٹ تھے اور اوپر وہ باسٹرڈ تھے تب مجھے صحن میں ایک شگاف سا نظر آیا اور
وہاں سیڑھیاں تھیں ان تک میں بہت دشواری سے پہنچا کہ میرے اوپر دھڑ ادھڑ
خون آلود پرخچے بوجھ بن رہے تھے تو میں پہلا تھا... جب یہاں کوئی نہ تھا تو میں
تھا...(۳۱)

قلعہ جنگی کے اس تہہ خانے میں عبدالحمید جان واکر اب زخمی حالت میں پڑا درد سے کراہ رہا ہے۔ اس لیے جب مرتضٰی بیگ گھوڑے کو پکڑنے کے لیے کہتا ہے کہ جانی تم کو بھی آنا ہوگا تو انکار کر دیتا ہے۔ چونکہ ایک تو وہ زخمی ہے اور درد سے کراہ رہا ہے اور اس لیے بھی انکار کر دیتا ہے کہ اُس کو گھوڑوں سے پیار ہے۔ امریکہ میں بھی اُس نے اپنا ایک ذاتی براونی رکھا ہوا تھا، اس لیے وہ گھوڑے کو نہیں مار سکتا۔ مرتضٰی بیگ سے کہتا ہے:

جانی کراہ رہا تھا اور امریکی لہجے میں کراہ رہا تھا...عبدالحمید جان واکر... تمہیں بھی آنا
ہوگا ....میں... گھوڑے کو ... کسی بھی گھوڑے کو مار نہیں سکتا اسے پکڑنا ہے اوپر جا
کر... وہ قلعہ جنگی کے کچے صحن کی چاندنی میں کہیں ہنہنایا تھا پکڑنے کے بعد تو مارنا
ہے... آئی کیناٹ کِل اے ہارس... نو میسٹر وہاٹ، آئی کیناٹ... سوری۔(۳۲)

افغانستان کی صورت حال مختلف تھی، یہاں لڑنے کے طریقے اور انداز بھی مختلف تھے۔ اب اس قلعہ جنگی کے تہہ خانے میں زخمی امریکی جان واکر جو کچھ محسوس کر رہا ہے اُس کو ان الفاظ میں بیان کرتا ہے

میں کیا بتاؤں... میں جانتا تو تم سے کیوں پوچھتا... کیونکہ میں تو شک اور شرمندگی کی
دلدل میں پھنسا ہوں کہ یہ میں نے کیا کیا... کن کے لیے لڑنے آ گیا. براونی نے
مجھے یہ احساس دلایا، براونی نے۔(۳۳)

قلعہ جنگی کا ساتواں اور آخری کردار ابو طالب چی چی کا ہے چونکہ اس کا تعلق چیچنیا سے ہے اس لیے اس کے مجاہد ساتھی اس کو چی چی کہتے ہیں۔ ان کا گاؤں چیچنیا کی بڑی آبادی والی بستی سے طویل فاصلے پر

داغستان کی سرحد کے قریب واقع تھا۔ساتھ ہرے بھرے کھیت تھے۔ابو طالب کواُن کی دادی نفیسہ نے پالا تھا اُس کے ماں باپ ایک بڑے سیلاب کی زد میں آ کر بہہ گئے تھے۔وہ اُس وقت اتنا چھوٹا تھا اُس کو اُن کی شکلیں بھی یاد نہ تھیں۔ جب وہ پیدا ہوا تھا تو اُس کے والد نے بندوق سے فائر کر کے وادی کے لوگوں کو بتایا تھا کہ اُن کے گھر پہاڑی عقاب پیدا ہوا ہے

ابو طالب نے ابتدائی تعلیم وادی کے دامن میں ایک گاؤں کی مسجد میں حاصل کی اور اس کے بعد وہ کاشتکاری میں مصروف ہوگیا۔جوان ہوا تو اُس کی دادی نے اُن کو امام شامل کی شجاعت کے قصے سنائے۔کیونکہ ان کی وادی میں امام شامل کے قصے دوہرائے جاتے تھے،اور اُن کے نام کی قسم کھائی جاتی تھی۔ابو طالب نے اُن کے قصے سردیوں کی سرد راتوں میں اپنی دادی نفیسہ خاتون سے سنے تھے۔اس کی دادی ان کو داغستان کے شاعر رسول حمزہ کی نظم سنایا کرتی تھیں۔چونکہ رسول حمزہ نے امام شامل کے خلاف نظم لکھ کر اُن کے زندگی کو بے نقاب کیا تھا کہ وہ ترکی اور برطانیہ کے جاسوس ہیں اور ان کا کام قوموں کے درمیان نفرت پھیلانا تھا۔لیکن آخر کار رسول حمزہ کو امام شامل پر نظم لکھنے پر معافی مانگنا پڑی۔وہ اپنی دادی کے کہنے پر جہاد میں شامل ہو۔اس حوالے ابو طالب کہتے ہیں :

> وہ اپنی بھیڑوں اور کاشتکاری میں مصروف مگن تھا جب ایک رات نفیسہ خاتون نے اس کے شانے کو جھنجوڑ کر اسے بیدار کیا۔غزوہ اور جہاد کے نعرے ابھی فرسودہ نہیں ہوئے ...میرے بچے ...امام شامل میرے خواب میں آئے تھے اور وہ کہتے تھے کہ کوہستان کی حرمت اور ناموس کو بچانے کے لیے گروزنی پہنچو۔(۳۴)

اس کے بعد میں ابو طالب گروزنی پہنچا۔ان کے ساتھ عربی ،پاکستانی ،سوڈانی ،اور افغانی مجاہد شامل تھے۔چونکہ روسی ٹینک گروزنی کو ملبے کے ڈھیر میں بدل رہے تھے۔اس گروزنی میں بہت سے لوگ ملبے میں ہی دفن ہو گئے تھے۔وہ اس احسان کا بدلہ چکانے آیا تھا،لیکن بدقسمتی سے اس تہہ خانے میں پہنچ گیا تھا۔اس تہہ خانے میں اس کی حالت ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے :

> شمالی روسیوں کا ساتھ دے رہے تھے ..تو وہ کیسے اُن کا ساتھ دے سکتا تھا تو ابو طالب ...جسے چیچنیا کے حوالے سے چی چی بھی کہا جاتا تھا یہاں قلعہ جنگی کے تہہ

خانے میں تھا...بے شک نیم مردہ تھا۔(۳۵)

قلعہ جنگی کے اس تہہ خانے میں دوسرے کرداروں کی طرح ابو طالب بھی اپنی سابقہ زندگی کو یاد کرتا ہے لیکن وہ دوسرے کرداروں کی طرح پچھتا نہیں رہا تھا۔ کیونکہ وہ تو عقاب تھا، پہاڑی عقاب، جو گروزنی کا احسان چکانے کے لیے جہاد میں شامل ہوا تھا۔ اس حوالے سے ابو طالب اپنی یادیں اس طرح بیان کرتا ہے:

> مجھے؟ مجھے اپنے آسمان یاد آتے ہیں جہاں کوّے نہیں عقاب پرواز کرتے ہیں...وہ گھر یاد آتے ہیں جہاں سے سرِ شام دھواں اٹھتا ہے تو ان آبشاروں تک جاتا ہے جو بلندیوں سے بوچھاڑ کرتے چٹانوں میں گھرے تالابوں میں گرتے ہیں ہر بلندی کی آغوش میں ایک ایسی جھیل روپوش ہے جس میں کوئی دوشیزہ بے خطر بے لباس تیر سکتی ہے۔ اور میں ان سب کو ترک کر کے افغانستان کے بے آب و گیاہ ویرانوں اور حسنِ جمال سے یکسر عاری لوگوں کی مدد کے لیے آ گیا ہوں۔(۳۶)

یہ سب لوگ ایک تصورِ کامل لے کر افغانستان آئے تھے اپنے اپنے خواب پورا کرنے آئے تھے، ایک کامل تصورِ حیات کا نظام نافذ کرنے اور برائی کی قوتوں کو پاش پاش کرنے آئے تھے۔ ان میں سے اللہ بخش ایک بونے کے کہنے پر افغانستان آیا، مرتضٰی بیگ بدی کی سلطنت کا خاتمہ کرنے والے کا بیٹا تھا، گل شیر ولی ایک افغانی کے کہنے پر جہاد میں شامل ہوا تھا، ابو طالب کو گروزنی کا احسان چکانا تھا، عبدالوہاب خادمین حرمین شریفین صدیوں سے سعودی عرب میں مروجہ بادشاہی نظام، جس کے سامنے اُن کو ہمیشہ مُہر بہ لب رہنا تھا، سے اُکتا کر طالبان میں شامل ہوا، ہاشم میر ایک سعودی لڑکے کی باتوں سے متاثر ہو کر افغانستان کا رخ کیا، اور عبدالحمید جان واکر جو ایک نئے عقیدہ کو نافذ کرنے آیا تھا اسی تہہ خانے میں مردہ حالت میں پانی کی سطح پر تیر رہا تھا۔

خس و خاشاک زمانے کے کرداروں پر 9/11 کے اثرات

مستنصر حسین تارڑ کا دوسرا اہم ناول خس و خاشاک زمانے ہے جس میں 1930ء سے لے کر 9/11 کے فوراً بعد تک کی صورتِ حال کو بیان کیا ہے۔ 9/11 کا سانحہ اس ناول کے پلاٹ کا حصہ ہے۔ اس ناول میں بہت سے ادوار کی صورتِ حال کو بیان کیا گیا ہے، اس لیے اس ناول میں کرداروں کی ایک بہت بڑی دنیا آباد ہے۔ اس ناول کے کچھ کردار تو بہت ہی عجیب و غریب قسم کے ہیں، جن میں بخت جہاں، سانسی، لہناں

سنگھ قابلِ ذکر ہیں۔

لیکن اس ناول کا اہم کردار انعام اللہ ہے۔ناول کے اسی کردار کے شخصی ارتقاء پر 9/11 کے اثرات موجود ہیں۔اس لیے یہ کردار اپنی منفرد حیثیت رکھتا ہے۔اس کردار کے ماں باپ کا کچھ پتا نہیں کہ یہ کس کا بچہ ہے کیونکہ یہ گورو مانگٹ کی مسجد کی سیڑھیوں میں پڑا ملا،یعنی اس کی پیدائش ناجائز تھی۔جب لوگ فجر کی نماز پڑھ کر واپس جانے لگے تو اس کی آواز سنائی دی۔نعت خواں اس بچے کو سنگسار کرنے کے لیے نمازیوں کو پتھر تلاش کرنے کو کہتا ہے، یہاں یہ نعت خواں مدت کے بعد ہاتھ میں آئی ہوئی مذہبی ڈوری کو ہاتھ سے نہ جانے کا موقع ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔اس لیے دوسرے درجن بھر نمازیوں کو جھڑک کر کہتا ہے کہ بدبختوں دیکھتے کیا ہوا جلدی کرو پتھر تلاش کرو اور اس نامراد کو یہی ختم کردو تا کہ برائی کو پھیلنے کا موقع نہ ملے۔

ابھی اس کو سنگسار کرنے کے لیے پتھر تلاش کے جا رہے تھے اور اس کے ساتھ نعت خواں مذہب پر اپنی ڈوری کو مضبوط کرنے کے لیے مذہبی احکامات بھی صادر کر رہا تھا کہ پتھر مارتے وقت احتیاط لازم ہے۔خون کے چھینٹے کپڑوں پر نہ پڑنے پائیں ورنہ مذہب کی روشنی میں وہ بھی حرامی ہو جاتا ہے۔اس سے پیشتر کہ نعت خواں کے کہنے پر بچے کو سنگسار کر دیا جاتا،ایک سانسی کھیتوں سے حاجتِ رفع سے فارغ ہو کر وہاں آجاتا ہے اور موقع کی نزاکت کو فوراً سمجھ جاتا ہے اور یہ کہہ کر کہ صاحب یہ میرا بچہ ہے،اس کو سنگسار ہونے سے بچا لیتا ہے اور نعت خواں سانسی سے غصہ میں کہتا ہے:

> اوئے تو کون ہے؟نعت خواں ایک اور پتھر نہ ملنے پر غصیلا ہو رہا تھا۔میں چوہدری جی...میں اس بچے کا باپ ہوں...دنیا پور کا سرو سانسی،آپ کا کتا مردار کھانے والا اور خود بھی مردار...یہ بچہ میرا ہے۔حرامی سویرے سویرے روئے چلے جاتا تھا چپ نہ ہوتا تھا...میں اسے گود میں اٹھا کر ادھر آگیا...کہ میں نے رفع حاجت کے لیے جانا تھا...میں اسے ساتھ کیسے لے جاتا..یہاں اللہ رسول کی پناہ میں چھوڑ کر ذرا کی ذرا کھیتوں میں چلا گیا تھا،فارغ ہونے کی خاطر...پہلے بھی ایسا کر چکا ہوں...یہ کسی کا گناہ نہیں ہے،اگر ہے تو میرا ہے۔(۳۷)

سانسی اس بچے کو گھر لے آتا ہے۔جس بچے کا پہلے ایک باپ بھی نہ تھا اب اس کو تین باپ مل گئے

تھے،ایک عزیز جہاں ،سانسی،اور امیر بخش ۔ان تینوں کی محبت اس کے لیے یکساں تھی ۔عزیز جہاں کہتا ہے کہ یہ اللہ نے انعام بھیجا ہے،اس کا نام انعام اللہ ہونا چاہیے ہے ۔لیکن سانسی کہتا ہے اس کو میں لے کر آیا ہوں اس لیے اس کا نام پیچو سانسی ہے ۔ جب یہ بڑا ہوگا تو ہم دونوں بیو پٹر مل کر نیولے پکڑا کریں گے، کتے بلی کھایا کریں گے ۔ لیکن امیر بخش کہتا ہے کہ اس کے کانوں میں کسی عقیدے کی مجبوری نہ اُونڈیلو،اس کو تعصب سے پاک رہنے دو ،جب بڑا ہوگا تو خود فیصلہ کرے گا کہ کاغذ پر سچ کی کونسی عبارت لکھنی چاہیے ۔

انعام اللہ امیر بخش کے ساتھ رہنے لگا ۔وہ عزیز جہاں ،سانسی ،تینوں کا بیٹا تھا ۔لیکن امیر بخش اس کو اپنا بیٹا جان کر دل وجان سے پیار کرتا تھا ۔تقسیم کے وقت انعام اللہ انیس برس کا ہو گیا تھا ۔اس وقت وہ ایک بہت کم گو شخصیت کا مالک تھا ۔اس عمر میں آ کر اس کو معلوم ہوا کہ میرا کوئی ماں باپ نہیں ہے ۔اب وہ سوچتا کہ میں کون ہوں ،میرے ماں باپ کون ہیں ۔موتی اور موجو بھی میرے بھائی نہیں ہیں تو پھر میں کون ہوں ؟ کہاں سے آیا ہوں ؟ آخر کار انعام اللہ سرو سانسی سے پوچھتا ہے کہ ابا کیا میں حرامی ہوں ؟اب اس بات کو چھپانا آسان نہ تھا کیونکہ اب وہ سمجھ دار ہو چکا تھا ،اور گورنمنٹ کالج سے بی اے کر رہا تھا ،لیکن بار بار یہ سوال دوہرانے پر کہ ابا کیا میں حرامی ہوں؟ سانسی جواب دیتا ہے:

> سرو سانسی کو اپنے نشے پر کچھ اختیار نہ تھا، جو کچھ وہ کہنا چاہتا تھا کہہ نہ سکتا تھا اور جو وہ کہتا تھا اُس پر بھی اُس کا کچھ اختیار نہ تھا...تو...اس ساری دھرتی کا بیٹا ہے تجھ سے بڑھ کر اور کوئی حلال کا نہیں ہے ...تو کسی بھی کھونٹے سے باندھا ہوا نہیں ہے ...کسی عقیدے یا مذہب سے باندھا ہوا چاکر نہیں ہے ...کنویں میں جوتا ہوا بیل نہیں ہے جس کی آنکھوں پر طے شدہ اخلاقی اقدار کے کھوپے چڑھے ہیں اور وہ اس اندھے پن میں ایک ہی کھونٹے سے باندھا گھومتا جاتا ہے...چکر لگاتا جاتا ہے اور سمجھتا ہے کہ حیاتی کا آسمانی مقصد یہی ہے ۔تو دیکھ سکتا ہے ...اپنے لیے اپنی پسند کی چراگاہ منتخب کر سکتا ہے ...تیرے گلے میں کوئی پنجالی نہیں ہے ۔جو تجھے قید کر دے ...سرو سانسی بولتا چلا گیا ۔(۳۸)

جب اس بات کا مکمل یقین ہو گیا کہ وہ حرامی ہے تو اس بات کا اُس کو بڑا دکھ ہوا اور ایسا لگتا تھا کہ جیسے

اچانک بوڑھا ہو گیا ہو ،لیکن قسمت کو کون شکست دے سکتا ہے۔انعام اللہ نے اسی دباو کے تحت اپنا انگریزی میں پہلا ناول ایک حرامی کی سرگذشت تحریر کیا۔اس ناول کا انگریزی اخباروں میں بہت چرچا ہوا،اور سب سے بڑھ کر یہ کہ یہ ناول اس سال کا مین بکر پرائز کے لیے نہایت موزوں قرار دے گیا۔اور بیسٹ سیلر ثابت ہوا۔

لیکن ضیاء الحق کے دور میں آٹو بائیو گرافی آف اے باسٹرڈ جیسا ناول اُس کے لیے قیامت خیز ثابت ہوا۔اس ناول کے شائع ہوتے ہی ضیاء الحق کے حواری انعام اللہ کے پیچھے پڑ گئے اور ناول کو بغیر پڑھے ہی سڑکوں پر آ گئے کہ یہ ایک فحش اور مخرب الاخلاق ناول ہے۔لیکن کچھ قصور اس میں انعام اللہ کا بھی تھا جس نے خود اقرار کرلیا کہ وہ حرامی ہے اور اس ناول کا مرکزی کردار وہ خود ہے۔یہ باعثِ تعزیر تھا۔انعام اللہ کی جان لینے کا فتویٰ ابھی بھی برقرار تھا اور اُس وقت بھی جب وہ گرو مانگٹ کی مسجد کی سیڑھیوں میں پڑا ملا تھا اور نعت خواں نے ہلاک کرنے کا فتویٰ جاری کر دیا تھا۔ضیاء الحق کے دور میں ایسا ناول لکھنے کی جسارت کرنا ،ضیاء الحق کے قوانین کی مخالفت کر کے اُس کے دل کو ٹھیس پہنچانے کے برابر تھا۔اور اس کے بعد ضیاء الحق سے اختلافی کالم لکھنے پر ان سب کاموں کا خمیازہ بھگتنا پڑا۔انعام اللہ کو موچی دروازے کی تاریخی جلسہ گاہ میں لکڑی کے تختے پر باندھ کر کوڑے مارے گئے۔اس حوالے سے مستنصر حسین تارڑ لکھتے ہیں :

> چونکہ وہ پردے پر اور حیا پر یقین رکھتے تھے اس لیے انہوں نے اتنا کرم کیا کہ اُس کی شلوار نہ اتاری ،صرف قمیض اور بنیان کو نوچ کر اُس کی پشت برہنہ کی گئی جدید ترین ساونڈ سسٹم کو اسلامی تقاضوں کے مطابق ڈھالا گیا اور انعام اللہ کے جکڑے ہوئے چہرے کے آگے ایک حساس مائیک نصب تھا ...میدان کے چاروں اور ایستادہ کھمبوں پر لاوڈ سپیکر آویزاں کے گئے تھے تاکہ مجرم کی پشت پر درے کا وار ہو تو اُس کا گوشت ادھڑے تو اُس کی دلدوز چیخوں کی آواز نہ صرف تماشائیوں تک پہنچے بلکہ مناسب طور پر شہر لاہور کے ہر گھر کے اندر سنائی دے اور لوگ نہ صرف اس شرعی نظام عدل کے معترف ہوں بلکہ عبرت بھی پکڑیں ...اور اُس روز لوگ عبرت نہ پکڑ سکے ...کہ انعام اللہ کہ پشت پر گھومتے ،لہراتے بدن کو تیل چپڑے ہوئے درّہ نواز نے جتنے بھی درّے مارے ،اُنھوں نے اُس کے ماس کو چیتھڑوں میں بدل

دیا پر اُس کا منہ بھنچا رہا...زبان دانتوں تلے آ کر کٹ گئی اور باچھوں سے لہو رسنے لگا پر وہ اس اذیت کو سہہ گیا...اگر اُس کی آنکھوں میں آنسو تھے تو وہ صرف اس لیے اُترے کہ اس برسرِ عام نیم برہنہ رسوائی کو سہنا ممکن نہ رہا تھا...اُس کے بدن کے اندر جتنی بھی رگیں اور شریانیں تھیں وہ اس برداشت سے چیخ گئیں پر اُس کا منہ بھنچا رہا۔(۳۹)

انعام اللہ کو پاکستان میں رہنا مشکل ہو گیا تھا،جس پر امیر بخش اُس کو کو ہدایت کرتا ہے کہ اس ملک میں رہنا اب اُس کے لیے اچھا نہیں کیونکہ منافت کی وہ پود تیار ہو چکی ہے جس کے سامنے تم کھڑے نہیں ہو سکتے۔ وہ تمہارے جیسوں کو تلف کر دی گی۔تم یہاں سے نکل جاو۔امیر بخش کے کہنے پر انعام اللہ امریکہ کا رختِ سفر باندھتا ہے۔اور نیو یارک کے جان ایف کینیڈی ایئر پورٹ پر جا اترا۔نیو یارک میں اُس کو اپنا رزق جس طرح کمانا پڑا اُس کے بارے میں انعام اللہ خود سے یوں سوال کرتا ہے:

یہ کیسا رزق ہے ...سیاہ پلاسٹک کے بھاری تھیلے کو جس میں نیو یارک شہر کی ساری گندگی،غلاغت،اور ثقافت تھی اپنے کاندھوں پر لادتے ہوئے انعام اللہ نے اپنے آپ سے سوال کیا...خالی ڈبے،...بوتلیں،کارٹن،پیشاب سے بھرے شاپر بیگ ...پیزا کے بوسیدہ ہو چکے ٹکڑے...غلیظ چیتھڑے،...اخبار...بچوں کے ڈائپر...سکڑ چکے کنڈوم...اس شہر کی ثروت اور گناہوں کا سارا بوجھ...یہ کیسا رزق ہے۔اُس نے اپنے آپ سے پوچھا...اُن کندھوں پر جنہیں بوجھ اٹھانے کی عادت نہ تھی۔(۴۰)

اچھی نوکری تلاش کرنے کے لیے انعام اللہ در بدر پھرتے ہوئے ایک بھکاری بن چکا تھا۔وہ ہر دکان،ریستوران،شراب خانے پر جاتا تھا کہ شاید کوئی اچھی نوکری مل جائے لیکن بے سود،ایک ہزارا خان اپنا پورا بھرا ہوا سٹور انعام اللہ کے سپرد کر دیتا ہے۔اور اس کے ساتھ ہی انعام اللہ کو کاروبار کے چند اصول بھی سمجھاتا ہے۔چند دن تو اُس نے سٹور پر کام کیا۔اس کے بعد یہ بھی عارضی ٹھکانا ثابت ہوا اور یوں انعام اللہ اسکے بعد نیو یارک میں ٹیکسی چلانے لگ جاتا ہے۔ٹیکسی ڈرائیونگ کے دوران مشائدے سے وہ یہ بات بھی

محسوس کرتا ہے کہ ایک ٹیکسی ڈرائیور اور طواف میں کچھ فرق نہیں ہوتا ،اور اسی مشائدے پر اپنا دوسرا ناول ٹیکسی ڈ رائیور اے پراسچی چیوٹ بھی تحریر کرتا ہے۔

جو لوگ معاشی یا اپنی جان کے تحفظ کی خاطر اپنی سر زمین کو چھوڑ کر کسی دوسری سرزمین پر جاتے ہیں،اُن پر کیا بیتتی ہے یہ وہ ہی جانتے ہیں ،جو اس کرب سے گزرتے ہیں۔انعام اللہ کو بھی اس کا شدید تجربہ ہو رہا تھا،وہ بھی اپنی سرزمین کو چھوڑ گیا تھا۔نیو یارک کے اخباروں میں جب کبھی اُن کی نظر ''P'' کے حروف پر جاتی تو دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی کہ شاید پاکستان کا کچھ ذکر ہے ،ترک وطن کی محرومیوں کا کچھ شمار نہیں۔لیکن انعام اللہ کے لیے اُس کی واحد محرومی امیر بخش تھا۔

پھر ایک دن نیویارک میں ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی عمارت میں دو طیارے پیوست ہو گئے اور پوری ایک سو دس منزلیں بڑی کمال سے ایک خاص ترتیب سے گرتی ہیں ایسے جیسے کوئی بہت ہی کار آمد تکنیک کا استعمال کیا گیا ہو۔ان گرتی ہوئی منزلوں میں انسانی جسم اور خون بھی شامل تھا۔امریکیوں کے لیے یہ واقعی قیامت سے کم نہ تھی۔اسی اثناء میں ایک فالنگ مین انعام اللہ کی ٹیکسی پر آ کر گرا،اس کی گردن انعام اللہ کی طرف مڑی ہوئی تھی جیسے کہہ رہا ہو کہ تہذیبوں کا تصادم ایسے حربوں سے شروع ہوتا ہے۔

9/11 کے بعد امریکیوں کے رویے یکسر بدل گئے ،اُن کو ہر مسلمان اُسامہ کا ساتھی نظر آنے لگا، پاکستان کو دہشت گردی کا محور قرار دیا گیا ،اسلام کو دہشت گردی کی تعلیم دینے والا مذہب قرار دیا ،ان کی اس نفرت کا نشانہ انعام اللہ بھی بنتا ہے

ایک فربہ امریکی ہانپتا ہوا پچھلی نشت پر گرا اور جب انعام اللہ نے گردن میں خم دے کر پیچھے مڑ کر اُس سے پوچھا کہ سر آپ کدھر جائیں گے ..تو جیسے اُس کے چہرے نے اُس کو ڈس لیا ہوا اور وہ ایک ہراس میں آ کر کہنے لگا

...آر یو

عرب؟

نو سر،آئی ایم ناٹ

اے موزلم؟

اگر چہ وہ محض نام کا مسلمان تھا انکار بھی کر سکتا تھا،لیکن اُس نے سر ہلا دیا

آئی ایم....

میں کہیں بھی نہیں جا رہا یو ٹیررسٹ...لیکن میں یہ بتا سکتا ہوں کہ تم کہاں جا رہے ہو

...جہنم میں ...

یوکین گوٹو ہیل،وہ دروازہ دھکیل کر باہر نکل گیا۔(۴۱)

انعام اللہ کے لیے یہ نفرت کی پہلی ترنگ تھی جو ایک خاص پلاننگ سے تیار کی گئی تھی ۔حالانکہ انعام اللہ کو ان میناروں کے ڈھے جانے کا بڑا رنج تھا۔ان میناروں کے ملبے تلے اُس کے اپنے ہم مذہب بھی دفن ہو گئے تھے ،اس میں وہ پاکستانی بھی دفن ہو گئے تھے جو اس ٹاور کے گرتے وقت اس کے اندر جا کر لوگوں کو بچانے کی کوشش کر رہے تھے ۔انعام اللہ نے ان تمام لوگوں کی یاد میں جو معصوم اور بے گناہ ہلاک کر دیے گئے تھے ایک موم بتی روشن کی تھی ۔جب کوئی بھی گورا مسافر اُس کی ٹیکسی میں سوار ہوتا اور یہ پتا چل جاتا کہ وہ ایک مسلمان ہے تو وہ گورے مسافر فوراً اُن کی ٹیکسی سے اتر جاتے ۔یہ عزت نفس کا مجروح پن تھا۔

انعام اللہ تو خود بنیاد پرستی اور مذہبی تنگ نظری سے تنگ آ کر اس رنگین دنیا میں آیا تھا۔لیکن تنگ نظری کا بھوت یہاں بھی اُس کا پیچھا کر رہا تھا۔حالانکہ وہ تو کسی بھی عقیدہ کا قائل نہ تھا،نہ اُس کے گلے میں کوئی تعصب کی مالا تھی ،وہ تو ایک آزاد انسان تھا۔اور اسی موقع پر اُس کا ناول ٹیکسی ڈرائیور اے پراسچی چیوٹ بک سٹالز پر آتا ہے تو لوگ بڑے شوق اور تجسس سے اس ناول کو پڑھتے ہیں ،جو انعام اللہ کی شخصیت کو بخوبی عیاں کرتا تھا۔

لیکن 9/11 کے بعد امریکہ میں پکڑ دھکڑ کا سلسلہ چل نکلا۔اس سرزمین پر لاکھوں لوگ سر چھپائے غیر قانونی طور پر مقیم چھوٹی چھوٹی مزدوریاں کرتے تھے ۔لیکن 9/11 کے بعد انعام اللہ کو عدالت کا دروازہ کھٹکٹانا پڑا۔تا کہ وہ اس ملک میں آسانی سے اپنی زندگی بسر کر سکے ۔لیکن ابھی تک انعام اللہ کا کیس زیرِ سماعت تھا۔اُس کا وکیل اُس کو ڈھارس دیتا کہ فکر کی کوئی بات نہیں اُس کا کیس بہت مختلف ہے ۔لیکن اس کے باوجود انعام

اللہ کے ذہن میں وَسوَ سے اٹھ رہے تھے۔اس حوالے سے مستنصر حسین تارڑ بیان کرتے ہیں:

> اُس کے دل کے جس گوشے میں تشدد اور ہلاکت کے ایک ذرّ ے کی بھی گنجائش نہ تھی وہاں احتجاج کا ایک خودکش بوٹا پھوٹ رہا تھا جسے وہ دبانے کی کوشش کرتا تو اُس کی کونپلیں بدن کے کسی اور کنج میں سر اٹھا لیتیں۔(۴۲)

9/11 کے اثرات قلعہ جنگی کے علاوہ بغداد پر بھی مرتب ہوئے ہیں۔قلعہ جنگی سے زیادہ بری صورتِ حال بغداد کے باغوں اور صحنوں کی تھی، کیونکہ بغداد میں انسانی بچوں کے ساتھ چڑیوں کے بچے بھی مر چکے تھے۔انعام اللہ ٹیلی ویژن کی سکرین سے نظر نہ ہٹاتا تھا۔وہ امریکی طیاروں کے نوخیز اور پُر جوش پائلٹوں کو مسکراتے ہوئے انگلیوں سے فتح کا نشان بناتے ہوئے دیکھتا تھا، جو پُر مسرت چہروں کے ساتھ بومب بیگڈاڈ.. .فک بیگڈاڈ کے نعرے بھی لگا رہے تھے۔انعام اللہ محلی کے شراب خانے میں اپنے دوستوں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔عراق پر حملوں نے اُس کے ذہن کو بری طرح متاثر کیا تھا۔وہ سوچتا تھا کہ آخر دو ٹاور کے گرنے کے بدلے میں پوری انسانیت اور انسانی تہذیبوں کو ختم کرنے کا کیا جواز ہے۔کیا یہی انصاف ہے۔آخر کار انعام اللہ کا صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور وہ بول اٹھا:

> اینڈ...انعام اللہ پاپا ہیمنگوے کی پورٹریٹ کے سائے میں سے اٹھ کھڑا ہوا اور مسکراتے ہوئے سب سے مخاطب ہو کر لیکن ایک سرگوشی میں کہا اینڈ فک نیویارک۔(۴۳)

یہ انعام اللہ کی پہلی نفرت کا اظہار تھا۔یہ ایسی نفرت تھی جس کے سبب انعام اللہ گرفتار ہو کر گوانتا ناموبے کی جیل میں جا سکتا تھا۔انعام اللہ نے اب تک غربت، معاشی مجبوری، دکھ، اور مذہبی تنگ نظری کے سوا کچھ نہ دیکھا تھا۔اس کے علاوہ ناانصافی، نامرادی، اور عزت نفس کی پامالی کا بھی احساس تھا۔اُس کے اندر مقابلے کی سکت نہ تھی۔وہ اپنے دوستوں سے مشورے کرتا تو اُس کے دوست مشورہ دیتے کہ تم کہیں اور چلے جاو،تم سے اب کچھ بعید نہیں کہ کیا کر گزرو، اس لیے روشن انعام اللہ کو کینیڈا جانے کا مشورہ دیتا ہے۔جس پر انعام اللہ ایک مرتبہ پھر ہجرت کرنے پر مجبور ہوا۔ان کی ہجرت کا جو سفر گرومانگٹ کی مسجد سے شروع ہوا تھا وہ ابھی تک جاری تھا۔

کینیڈا میں مقیم ہو کر انعام اللہ اب اپنے تیسرے ناول کو تخلیق کرتا ہے، جس کی ابتدا بغداد میں مرنے والی چڑیوں سے ہوتا ہے۔انعام اللہ نے بہت سی چیزوں اور واقعات کو اپنے ناول کے پلاٹ کا حصہ بنایا ۔انعام اللہ کے اس ناول میں افغانستان کا اپاہج شدہ بچہ بھی موجود ہے، جس کو انسانی ضمیر کی تاریخ نے فراموش کردیا تھا۔اوراسی ناول کے پلاٹ میں بغداد کی چڑیوں کا بھی قصہ موجود ہے۔اس ناول کا نام سپیروز آر ڈیڈ رکھا گیا

ایک وہ دور تھا جب انعام اللہ امریکہ میں نیویارک کے شہر کے گناہوں کا بوجھ ڈھوتے ہوئے اپنے آپ سے سوال کرتا کہ یہ کیسا رزق ہے اور اب یہ دور ہے کہ انعام اللہ کینیڈا میں ایک گفٹ فار بی ز جیسے منافع بخش سٹور کا مالک ہے، جہاں سانسی کی پوتی شباہت روزانہ آ کر اُن کی دوکان سے ایک ہاتھی خریدتی اور اس طرح وہ اس کی محبت میں گرفتار ہوگئی۔یہ شباہت ہی تھی جس نے انعام اللہ کو خودکشی کرنے سے روکا، کیونکہ ایسا کرنے سے وہ اپنی عزتِ نفس کے مجروح پن کی تلافی چاہتا تھا۔شباہت اور انعام اللہ دونوں اب زندگی کے ایک طویل سفر پر نکلتے ہیں۔وہ ایسا جہان آباد کرنا چاہتے ہیں، جہاں امن ہو، تعصب کی کوئی جگہ نہ ہو، بم بارود نہ ہو، انسانی نفرتیں نہ ہو۔شباہت نے اپنی کار میں ضروریاتِ زندگی کا کچھ سامان رکھا اور دونوں کار میں بیٹھ کر طویل سفر پر روانہ ہو جاتے ہیں، جہاں وہ ایک نیا جہان آباد کرنا چاہتے ہیں، انعام اللہ شباہت سے کہتا ہے:

> انعام اللہ کی ہتھیلی شباہت کے فی الحال ہموار پیٹ پر اتری، اُس کے اندر ایک کونپل کی جو دھک دھک دھڑکن تھی اُسے محسوس کیا...اور اُس نے کہا چلو اس دنیا کو دوبارہ آباد کرتے ہیں۔(۴۴)

حوالہ جات

1۔ مستنصر حسین تارڑ، قلعہ جنگی، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، سن ۲۰۰۸، ص ٦

2۔ ایضاً، ص ۱۰۴

3۔ ایضاً، ص ۱۰٦، ۱۰۷

4۔ ایضاً، ص ۱۰۷، ۱۰۸

5۔ ایضاً، ص ۳۸

6۔ ایضاً، ص ۲۱۱

7۔ ایضاً، ص ۱۴۹

8۔ ایضاً، ص ۱۵۲، ۱۵۳

9۔ ایضاً، ص ۱۵۴

10۔ ایضاً، ص ۱۵۴

11۔ ایضاً، ص ۱۷۲

12۔ ایضاً، ص ۵۹

13۔ ایضاً، ص ٦۰

14۔ ایضاً، ص ٦۳

15۔ ایضاً، ص ٦۵

16۔ ایضاً، ص ۱٦۷، ۱٦۸

17۔ ایضاً، ص ۸۰

18۔ ایضاً،ص،۷۰

19۔ ایضاً،ص،۹۴

20۔ ایضاً،ص،۹۶

21۔ ایضاً،ص،۷

22۔ ایضاً،ص،۸۰

23۔ ایضاً،ص،۱۷۰

24۔ ایضاً،ص،۱۳۳

25۔ ایضاً،ص،۱۳۶

26۔ ایضاً،ص،۱۳۱۔۱۳۲

27۔ ایضاً،ص،۱۳۷

28۔ ایضاً،ص،۷

29۔ ایضاً،ص،۱۱۸

30۔ ایضاً،ص،۱۲۱

31۔ ایضاً،ص،۱۶۶

32۔ ایضاً،ص،۷

33۔ ایضاً،ص،۱۸۳

34۔ ایضاً،ص،۷۶

35۔ ایضاً،ص،۷۶

36۔ ایضاً،ص،۱۷۳

37۔ مستنصر حسین تارڑ، خس و خاشاک زمانے ،سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، سن ۲۰۱۳،ص،۲۵۹، ۲۶۰

38۔ ایضاً،ص،۳۶۳

39۔ ایضاً،ص،۴۱۶

40۔ ایضاً،ص،۴۳۶

41۔ ایضاً،ص،۵۰۳

42۔ ایضاً،ص،۵۶۷

43۔ ایضاً،ص،۵۸۳

44۔ ایضاً،ص،۷۴۰

باب پنجم

قلعہ جنگی اور خس و خاشاک زمانے میں سیاسی علائم و استعارات کا استعمال

قلعہ جنگی میں سیاسی علائم واستعارات کا استعمال

یونانی لفظ symballeion کا مطلب ہے۔ساتھ رکھنا اسی سے لفظ symbolon بنا۔symbol کے لیے اردو میں علامت کا لفظ رائج ہے۔اردو فکشن میں اور شعریات میں ''اشارہ''نشان اور رمز کے الفاظ بھی علامت کے طور پر استعمال کیے جاتے ہیں۔ادب میں علامت ایک شے اپنے لغوی معنی سے اگے کسی اور شے کو ظاہر کرنے کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔اردو شاعری میں استعمال کیے گئے استعاروں میں بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔ یورپی ادبیات میں بودلیر میں راں بو،والیری اور میلارمے کے نام قابل ذکر ہیں۔ میلارمے کی علامت نگاری کو اردو میں میراجی نے متعارف کروایا۔علامت نگاری کے حوالے سے ڈاکٹر سہیل احمد اپنی کتاب منتخب ادبی اصلاحات میں بیان کرتے ہیں:

> رمز یا علامت کسی وقت مطلب کو خفیہ یا پوشیدہ رکھنے کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے مثلاً طریقت میں اِس طریقے سے مقدس علوم کی حفاظت کی ہے نا اہلوں سے انھیں بچایا جاتا ہے۔اصل مفہوم سے رمز شناس ہی واقف ہو سکتے ہیں۔دوسرے ظاہری سطح پر ہی اُلجھے رہتے ہیں اسی طرح کسی دہشت ناک،سیاسی سماجی ماحول میں یہ سچی بات کہنے اور پھر بھی مخفی رہنے کا ایک حربہ بھی ہوسکتا ہے۔مگر علامت کو بزدلی سمجھنا (جیسا کہ اُردو کے بعض سادہ لوح ناقدین نے کہا ہے)رموز کی معنویت سے مکمل بےخبری کی دلیل ہے۔(۱)

اردو فکشن میں سیاسی علائم و استعارات کا استعمال بڑی اہمیت کا حامل ہے۔اِن سیاسی علائم و استعارات کا استعمال پیچیدہ قسم کے مسائل کی طرف نشاندہی کرنے کے لیے مصنف بڑی مہارت سے استعمال کرتا ہے۔یہ روایت قدیم عہد سے ہی مستحکم ہے سیاسی علائم کا استعمال اُس وقت بڑی اہمیت رکھتا ہے،جب اپنی بات یا مدعا کسی وزیر،بادشاہ یا پھر سخت دل حکمران کے سامنے پیش کرنے کا معاملہ ہو۔

علامت میں بات کنایہ کے انداز میں کی جاتی ہے۔یعنی بات کو کسی کے ڈر کی وجہ سے پردے میں چھپا کر بیان کیا جاتا ہے۔اس قسم کی صورتِ حال تقریباً تیسری دنیا کے ممالک میں زیادہ عام ہے۔اس طرح پاکستان کے اندر بھی کئی دور آمروں کے زیرِ نگرانی گزرے ہیں۔اس دور میں پاکستانی ادیب بات کو پردوں میں

چھپا کر بیان کرتے تھے، کیونکہ حاکمِ وقت کا خوف ہوتا تھا مشہور فلمی جملہ ''نواں آیاں ایں سونیا'' اس کی عمدہ مثال ہے۔

اس حوالے سے مستنصر حسین تارڑ کا ناول قلعہ جنگی ایک مشہور ناول ہے جس میں گیارہ ستمبر کے بعد امریکی انتقام اور افغانستان کی صورتِ حال کو نہایت ہی موثر علامتی تناظر میں بیان کیا گیا ہے ناول میں گھوڑے کی علامت کو بنیاد بنا کر افغانستان پر امریکی حملہ اور افغانستان کی موجودہ صورتِ حال کو بیان کیا ہے۔ گھوڑے کی علامت سارے ناول پر محیط ہے سویت یونین کے بعد امریکہ کے لیے افغانستان ایک قیمتی گھوڑے کی اہمیت رکھتا تھا، جس طرح پرانے زمانے میں گھوڑا ایک قیمتی اور کارآمد تصور کیا جاتا تھا، اسی طرح امریکہ کے لیے افغانستان قیمتی اور کارآمد تھا جس کو حاصل کر کے وہ معدنی ذخائر کو اپنے کنٹرول میں کرنا چاہتا تھا، جس کی بدولت بے پناہ معاشی فوائد حاصل کیے جا سکتے تھے یورپ خصوصاً امریکہ اور برطانیہ کے ساتھ یورپی بینکوں کی نظر افغانستان پر بہت پہلے سے ہی مرکوز تھی۔ اس حوالے سے ڈاکٹر مجاہد کامران، جان کے کولی، نوم چومسکی، ارون دھتی رائے، کی تحریریں خاصے کی چیزیں ہیں جس طرح یورپی ملکوں اور بینکوں کی نظر افغانستان پر مرکوز تھی اسی طرح قلعہ جنگی کے تہہ خانے میں موجود کرداروں کی نظر گھوڑے پر مرکوز ہے جن کے وہ ہی مقاصد ہیں جو امریکہ کے ہیں اس مماثلت کو سیاسی استعارہ بنا کر یوں پیش کیا ہے:

> گھوڑا ہے
>
> کہاں ہے؟
>
> اوپر ...قلعہ جنگی کے صحن میں ...
>
> وہاں گھوڑا کیسے ہوسکتا ہے ...لاشوں کو کھانے آیا ہے؟
>
> نہیں ہے ...سچ مچ کا گھوڑا ہے ...کان لگا کر سنو ....
>
> تہہ خانے میں اترتی پہلی تین سیڑھیوں پر چاندنی بچھی تھی ...اُن سب کی نظریں اُن تین سیڑھیوں تک اُٹھی ہوئی تھیں ..
>
> اوپر کوئی نہیں .....ہے ...میں نے خود سنا ہے

وہ کان لگائے اتنی دیر منتظر رہے کہ اونگھنے لگے اور پھر ایک مدہم سی ہنہناہٹ تہہ خانے کی سینتیس سیڑھیاں اُترتی اُن کے کانوں تک آئی اور آتے ہی مزید مدہم ہو گئی۔

میں نے کہا تھا ناں کہ ہے....سنو اگر ہم اسے پکڑ لیں تو کھا سکتے ہیں کس کو؟

گھوڑے کو...(۲)

گیارہ ستمبر کی نام نہاد جنگ کا انتقام لینے کے لیے امریکا افغانستان پر حملہ کرنے کے سوچ بچار میں پڑ گیا۔اس حوالے سے وہ اپنے اتحادیوں سے صلاح مشورے کرتا رہا،شاید اُن کو ڈر تھا کہ افغانستان پر حملہ اُن کی معاشی صورتِ حال کو مہنگا نہ پڑ جائے۔اگر امریکہ افغانستان پر حملہ کرتا ہے تو اس کا ردِ عمل کیا ہوسکتا ہے۔ان سب باتوں نے امریکہ کو To be or not to be کے چکر میں ڈال دیا۔گھوڑے کو مارتے وقت ناول کے کرداروں میں بھی To be or not to be کا تجسس موجود ہے،اس صورتِ حال کو سیاسی علائم کے ذریعے یو ں بیان کیا گیا ہے:

گھوڑے کو کون مارے گا؟ چی چی نے کہا

مرتضیٰ نے کہا تم گل شیر....

نہیں یارا ہمارا طبیعت خراب ہے....کلاشنکوف چلانے کو جی نہیں چاہ رہا.

ورنہ ہمارا لوگ تو انسان کو بے دریغ مارتا ہے جانور کیا چیز ہے۔ بہانے نہیں بناؤ خاں صاحب ...گھوڑوں کے بارے میں تمہارا تجربہ بہت وسیع ہے ..تمہارا باپ بھی تو نواب کے بیمار گھوڑوں کو کرتا ہوگا۔تو تم بھی کر سکتے ہو۔

.... چی چی کی جانب سے کوئی جواب نہیں آیا...

بولو چی چی

مرتضیٰ بیگ ادھر ہمارے چیچپنیا میں گھوڑوں کو اولاد کے برابر درجہ دیتے ہیں بلکہ اُس سے بھی بلند ....اولاد کو مارنا مشکل ہوتا ہے ...کوئی اور بے

شک مار دے خود مارنا مشکل ہوتا ہے ،عبدالوہاب کو بولو ...یہ بدو لوگ عادی ہوتے ہیں۔

عبدالوہاب بھی چپ رہا.... بولو عبدالوہاب

اخی چی چی کہتا ہے اُن کے ملک میں گھوڑا اولاد کے برابر ہوتا ہے لیکن ایک عرب کے لیے گھوڑا عزتِ نفس ہوتا ہے ...

بھائی مجھے آزمائش میں نہ ڈالنا ...اللہ بخش جان گیا کہ اب شاید اُس کا نام لیا جائے ۔ مجھے پتا ہی نہیں کہ گھوڑے کو کس طرح مارتے ہیں۔ تاریکی میں صرف لبلبی دبانی ہے کلاشنکوف کی نالی اُس جانب کر کے اور بس ...

تو تم کر لو ...اگر میں کر سکتا تو تم لوگوں کی منت سماجت کیوں کرتا ...

عبدالحمید سلمان فارسی ....تم ...

نہیں جانی صرف اتنا کہا

کیوں نہیں ...

آئی لو ہارسز ....آئی کینناٹ شوٹ ہارسز ...

جانی اپنی مختصر اردو بھول گیا اور بھڑک کر اپنی امریکی انگریزی میں رواں ہو گیا۔(۳)

تیسری علامت مغربی پالیسی سازوں کے حوالے سے ہے۔گیارہ ستمبر کے بعد امریکہ اور مغربی پالیسی سازوں نے دہشت گردی کے خلاف جنگ کا علان کر دیا۔اسی بات پر تنقید کرتے ہوئے نوم چومسکی اپنی کتاب گیارہ ستمبر میں بیان کرتے ہیں :

......افغانستان پر حملہ کے نتیجے میں بہت سے معصوم شہری ہلاک ہو جائیں گے ممکنہ طور پر ایک بڑی تعداد ۔ایک ایسے ممالک میں جہاں وہ بھوک کے مارے پہلے ہی

> موت کے کنارے پر ہیں ،معصوم شہریوں کا بے دریغ قتل دہشت گردی زمرے
> میں آتا ہے۔یہ دہشت گردی کے خلاف جنگ نہیں۔(۴)

مغربی پالیسی سازوں نے نام نہاد جنگ کے بہانے تراشنے شروع کردیے کبھی گھبراہٹ میں صلیبی جنگوں کا نام لیا گیا ،کبھی مسلمانوں کو انتہا پسند اور دہشت گرد قرار دیا گیا یہاں تک کے پاکستان کو واضح طور پر دھمکی دی گئی جبکہ گیارہ ستمبر کے سانحہ میں کوئی پاکستانی بھی ملوث نہ تھا اس سب کے باوجود مسلمانوں کو مجرم گردانا جانے لگا بنیاد پرستی کے بعد ،انتہا پسندی اور مسلمانوں کو خصوصاً افغانستان کو دہشت گردی کا محور قرار دیا گیا۔

ان سب کے پسِ پردہ حقائق یہ ہیں کہ مسلمان دنیا کے ساٹھ ستر فیصد وسائل کے مالک ہیں۔امریکہ ان وسائل کو اپنے کنٹرول میں کر کے واحد عالمی حکومت One world government کا قیام ہے۔اس لیے امریکہ نے مسلمانوں کو عالمی امن کے لیے سنگین خطرہ قرار دے دیا۔اس حوالے سے ثروت جمال اصمعی اپنی کتاب دہشت گردی اور مسلمان کے تعارف میں بیان کرتے ہیں:

> مغربی پالیسی سازوں نے ایک مدت سے مسلمانوں کو مجرموں کے کٹہرے میں کھڑا کر رکھا ہے۔بنیاد پرستی اور انتہا پرستی جیسے الزامات کے بعد گزستہ کئی برس سے دہشت گردی کا ٹھپا لگا کر انہیں عالمی امن کے لیے سنگین خطرہ قرار دے دیا گیا ہے اسی الزام میں مسلم ملکوں کو تاخت وتاراج کیا جا رہا ہے ،اور ان کی آبادیوں کو کھنڈرات میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ستم ظریفی یہ ہے کہ یہ الزامات وہ طاقتیں لگا رہی ہیں جنہوں نے مسلمانوں کے سو فیصد جائز حقوق علی الاعلان غصب کر رکھے ہیں۔یہ طاقتیں اپنی ظالمانہ اور غیر منصفانہ پالیسیوں کے خلاف مسلمانوں کے احتجاج اور مزاحمت کو دہشت گردی کا نام دے کر اپنی غاصبانہ کاروائیوں کے لیے جواز مہیا کرنے کی حکمت عملی پر کاربند ہیں۔تاہم وقت نے ان کے الزامات کا سراسر کھوکھلا ہونا پوری طرح ثابت کر دیا ہے۔یہ حقیقت پوری طرح عیاں ہو چکی ہے کہ عالم اسلام کے خلاف مغربی پالیسی سازوں کی جاحانہ کاروائیاں کسی دہشت گردی کی روک تھام کے لیے بلکہ اس کے وسائل پر قبضہ کے لیے ہیں.....(۵)

جس طرح امریکہ اور مغربی پالیسی سازوں کا یہ خیال ہے کہ ہمارے معاشروں میں امن اور زندہ رہنے کے لیے ضروری ہے کہ افغانستان پر حملہ کر کے اس کے معدنی وسائل پر قبضہ کر لیا جائے اسی طرح قلعہ جنگی میں کرداروں کی بھی یہی ذہنی کیفیت ہے کہ اگر گھوڑے کو مار کر کھا لیا جائے تو ہم چند دن اور زندہ رہ سکتے ہیں۔ انسانی بقاء کی اس کشمکش کو سیاسی عالمی تناظر میں کرداروں کے ذریعے یوں بیان کیا گیا ہے:

> ہم پر وہ وقت آنے والا ہے جانی ....جب ہم اس گھوڑے کو زندہ کھا جانے کے بارے میں سوچنے لگیں گے ....اپنی تمام تر گھوڑا اخلاقیات کہ یہ ہمیں اولاد سے بھی زیادہ عزیز ہے ...ہماری عزت نفس ہے ...ہم سب یہ بکواس بھول کر اپنی بھوک اور پیاس کے سامنے سرنگوں ہو کر اسی گھوڑے کی پشت پر اپنے دانت گاڑھ کر منگولوں کی مانند اس کا خون پینے لگیں گے ...ہم پر وہ وقت آنے والا ہے ...ابھی ہم میں کچھ سکت باقی ہے ...اگر اب ہم اس کو ہلاک کر کے اس کا گوشت نہیں نگلتے تو کل تک ....اگر کل آئی تو ...ہم اتنے لاغر اور لاچار ہو چکے ہوں گے کہ اسے مارنے کے لیے ہماری انگلیوں سے کلاشنکوف کی لبلبی بھی نہیں دبائی جائے گی ....کم آن جانی۔(۲)

مغربی معاشروں کو مغربی پالیسی ساز یہ باور کراتے رہے کہ آپ کی سلامتی کے لیے ضروری ہے کہ دہشت گردوں کو ختم کیا جائے۔آپ کے پُر امن زندگی بسر کرنے کے لیے ضروری ہے کہ فغانستان جیسے مہلک ملک کو ختم کیا جائے ورنہ آپ کے معاشروں اور زندگیوں کو شدید خطرات لاحق ہیں۔پسِ پردہ حقائق یہ ہیں کہ دوسرے ملکوں کے مال کو ضبط کر کے زندہ رہنے کا طریقہ اپنایا جائے۔اس بات کو سیاسی علائم میں مستنصر حسین تارڑ اپنے ناول خس و شاک زمانے میں یوں بیان کرتے ہیں:

> انسان یا انسانی حیات کی بقاء صرف تبھی ممکن ہوتی ہے جب وہ دوسرے کے حصے کی سانس چھین سکے،شکار تک اُن سے پہلے پہنچ جانے کی چالاکی اور سکت رکھتا ہو سانس بھی گنے چنے ہوتے ہیں اور شکار بھی سب کے حصے میں آنے والے نہیں ہوتے یوں بقاء کی اس دوڑ دھوپ میں انسان یا انسان کے مقابلے میں اور کبھی

> انسان حیوان کے مقابلے میں آ کر اُس ہدف تک پہنچنے کی سعی کرتا ہے جس میں اُس کے لیے زندگی کے کچھ سانس ہوتے ہیں ، پیٹ کی بھوک کو بھسم کرنے کے کچھ سامان ہوتے ہیں یوں انسان کبھی بھی دنیا کے کسی خطے میں پرندوں کے مدِ مقابل نہ ہوا تھا...اور نہ ہی کبھی پرندے اس کے رقیب ہوئے تھے پر یہ سرزمین دنیا جہاں سے الگ اور انوکھی تھی جہاں کے پرندے بھی اور طرح کے تھے اور انسانوں کی جبلت بھی جدا تھی ... پرندوں میں وہ دانش دھڑکتی تھی جو انسانوں سے مخصوص تھی اور انسانوں میں پرندوں والی خصلتیں پھڑ پھڑاتی تھیں ...تو یہاں دنیا جہاں سے الگ وہ اپنی اپنی بقاء کی جدو جہد میں ہلکان ہوتے ...ایک دوسرے کے رقیب ہوتے ۔(۷)

چوتھی علامت افغانستان پر حملے کو ظاہر کرتی ہے ۔امریکہ نے گیارہ ستمبر ۲۰۰۱ء کو دہشت گردی کا بہانہ بنا کر افغانستان پر حملہ کر دیا ،تا کہ جلد از جلد افغانستان پر قبضہ کر کے معدنی ذخائر پر قابض ہو سکیں اور اپنے پیٹ کی بھوک کو بھسم کیا جا سکے ،کیونکہ یہ نام نہاد جنگ تھی جو افغانستان پر مسلط کر دی گئی تھی اِس لیے امریکی بوکھلاہٹ صاف ظاہر تھی ۔مبشر حسن اپنی کتاب شاہراہ انقلاب :امریکہ کی پسپائی میں بیان کرتے ہیں :

> گیارہ ستمبر ۲۰۰۰ء امریکی صدر جارج بش نے دہشت گردی کے خلاف اعلان جنگ کر دیا ۔یہ بھی کہہ دیا کہ اس جنگ میں جو ہمارا ساتھ نہ دے گا اسے مخالف تصور کیا جائے گا بوکھلاہٹ اور دیوانگی کے عالم میں امریکی صدر نے یہاں تک کہہ دیا کہ دہشت گردی کے خلاف لڑائی صلیبی جنگ ہے یعنی عیسائیت کی اسلام سے جنگ ہے۔ جب ہوش آیا تو اپنے الفاظ کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ جنگ مسلمانوں کے خلاف نہیں ہے بلکہ دہشت گردی کے خلاف ہے ۔(۸)

جنگ میں جو ہمارا ساتھ نہ دے گا اُس کو مخالف تصور کیا جائے گا ارون دھتی رائے نے اس پر تنقید کرتے ہوئے کمال درجے کی تاثیر اور تجسس پیدا کیا ہے ۔ارون دھتی رائے اپنی کتاب سرمایہ داریت راستی جبر اور مزاحمت بیان کرتی ہیں :

کسی کو امریکہ دشمن قرار دینا یا پھر ہر حوالے سے امریکی دشمنی پر تل جانا... یا قطعی طور پر ہندوستان مخالف ہو جانا، نہ صرف نسل پرستانہ رویہ ہے بلکہ کسی ادارے یا شخص کی تنگ نظری کی علامت بھی ہے۔ یہ ایک خاص قسم کی کوتاہ بینی جس میں معاملات کو اسٹیبلشمنٹ کے نقطہ نظر سے ہٹ کر دیکھنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ ایسی صورتِ حال میں یہ کہا جاتا ہے کہ اگر آپ بش کی حمایت نہیں کرتے تو پھر آپ طالبان کی حمایت کر رہے ہیں۔یعنی اگر آپ ہم سے محبت نہیں کرتے تو یقیناً آپ ہم سے نفرت کرتے ہیں۔اگر آپ اچھے نہیں ہیں تو لامحالہ برائی پر کمر بستہ ہیں۔اگر آپ ہمارے ساتھ نہیں ہیں تو یقیناً دہشت گرد ہیں۔(۹)

افغانستان پر امریکی حملہ انفرادی اور اجتماعی طور پر تمام دنیا کو اپنے کنٹرول میں کر کے عالمی سرمایہ داری پر اجارہ داری کو جنم دینے کے برابر ہے۔یہ حملہ امریکی اور مغربی ممالک کی منافقتوں، اور غیر منصفانہ پالیسیوں کی نشاندہی کرتا ہے۔اس کے لیے انکل سام تیسری دنیا کے حکمرانوں کو بھی اپنے سرمایہ دارانہ مفاد کے لیے استعمال کرنے کے بعد جب چاہے راستے کے کانٹا کی طرح رستہ سے دور کر دیتا ہے، اور بعض دفعہ امن کے لیے سنگین خطرہ قرار دے کر صفحہ ہستی سے ہی مٹا دیتا ہے۔افغانستان پر حملہ کا منصوبہ امریکہ بہت پہلے ہی بنا چکا تھا، جس کے لیے کوئی بہانہ تراشنا ضروری تھا، جس کے لیے گیارہ ستمبر جیسی عالم تراکیب بہت اہم تھی۔اس سانحہ کو ہر ایک نے نئے عالمی تناظر میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ڈاکٹر نجیبہ عارف نے اپنی کتاب 9/11 اور پاکستانی اردو افسانہ میں اس نئے دور کی عالمی ترکیب کو یوں بیان کرتی ہیں:

مابعد کی اس دنیا میں دو بلند و بالا عمارتوں کا گرنا، دراصل دو خلاؤں کی تشکیل ہے ایسی تخریب جس کی بنیاد پر نئی تعمیر ہو سکتی ہے۔یہ واقعہ ایک عہد کی فصیل اور دوسرے عہد کا دروازہ ہے۔یہ بات بش اور اوباما کی تقریر سے لے کر، اسکول کے بچے کے مباحثے تک کئی بار کہی اور سنی گئی ہے کہ گیارہ ستمبر کا دن عہدِ جدید کی تاریخ کا اہم ترین دن ہے، جب پرانی جمی جمائی زندگی کی بساط اُلٹ گئی اور مشرق و مغرب کے درمیان ایک نیا رستہ استوار ہوا۔اس اُلٹی ہوئی بساط کو، اس نئے رستہ

کے پیچ وخم کو، ہر ایک نے اپنے اپنے فکری ،تاریخی اور واقعاتی تناظر میں دیکھنے کی
کوشش کی ہے۔(۱۰)

افغانستان پر امریکی حملے کی نئی عالمی ترکیب اور کرداروں کا گھوڑے کو ہلاک کر دینے میں مماثلت موجود ہے یہاں پر گھوڑے کو ہلاک کرنے کی علامت گیارہ ستمبر کے پس منظر میں افغانستان پر امریکی حملے کو ظاہر کرتی ہے۔کرداروں کے ذریعے گیارہ ستمبر کے اس علامتی تناظر کو یوں ظاہر کیا گیا ہے

صرف گھوڑا تھا جو منتظر تھا.....

اور وہ جانتا تھا کہ جو اُس کی پشت کو پیار سے سہلانا جانتا ہے بس وہی اُسے اس اذیت سے نجات دلا سکتا ہے.....جو زخمی ہونے میں اور اندھیرے میں ہونے سے تھی...سناٹے اور اندھیرے میں جب کہ تہہ خانے میں اُترنے والی پہلی سیڑھی سے بھی مکر چاندنی سمٹنے والی تھی ...ایک شعلہ بھڑکا اور ایک بھاری وجود کے گرنے کی آواز نے سناٹے کو پاش پاش کر دیا۔(۱۱)

ایک شعلہ بھڑ کنے اور بھاری وجود کے گرنے میں افغانستان پر حملے کا خوبصورت علامتی انداز پنہاں ہے ،جو عالمی سیاسی استعارے کا علامتی تناظر ہے۔

پانچویں علامت امریکی اتحادیوں کا افغانستان پر حملہ اور گھوڑے کو ہلاک کرنے کے لیے جانے والے کرداروں کی مماثلت ہے۔امریکہ افغانستان کے مقابلے میں طاقتور ملک ہے جس کے پاس لا تعداد کیمیائی ہتھیار ہیں ،بم ،میزائل ہیں جو معیشت کے لحاظ سے بھی کئی گناہ مضبوط ہے۔ہر طرح کی جدید ٹیکنالوجی اور سہولت سے آراستہ ہے۔جبکہ دوسری طرف افغانستان جیسا کمزور ،غریب ،ملک ہے جس کے عوام کے پاس نہ پہننے کو کپڑا ہے اور نہ خوراک ،عوام پہلے ہی غربت کا شکار ہے۔ایک طرف دنیا کا طاقتور ملک جبکہ دوسری طرف دنیا کا کمزور ترین ملک، امریکہ اگر تن تنہا افغانستان پر حملہ کر دیتا تو تب بھی کوئی مسئلہ نہ تھا مگر اس سب کے باوجود امریکہ نے افغانستان پر تنہا حملہ نہیں کیا بلکہ طاقتور ترین ملک ہونے کے باجود بھی اپنے اتحادیوں کے ساتھ مل کر حملہ آور ہوا۔

قلعہ جنگی میں اس صورتِ حال کو علامتی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔گھوڑے کو پکڑنے کے لیے ایک مجاہد کا ہونا کافی تھا،لیکن گھوڑے کو پکڑنے کے لیے بھی ایک مجاہد نہیں جاتا بلکہ کئی مجاہد جاتے ہیں اور گھوڑے کو تہہ خانے میں لا کر ہلاک کرتے ہیں ۔مستنصر حسین تارڑ بیان کرتے ہیں :

وہ اُٹھے....

کیسے اُٹھے ...یہ تو وہی جانتے تھے ...پیپ سے رِستے بدن کو مردہ کرتے زخموں
...کی کرچیوں کی چبھن برداشت کرتے ...بدن میں آرام کرتے ڈیزی کٹر کے لوہے
....بنکر بسٹر کے ٹکڑے ...تین دن اور تین راتوں کی نڈھال بھوک اور پیاس کو
سہارتے جانے کیسے اُٹھے ...مگر اُٹھے(۱۲)

افغانستان پر حملہ کرنے کے بعد امریکہ نے ایک اور نئی الجھا دینے والی ،اعصاب شکن نئی عالمی ترکیب good or bad taliban کی اصطلاح استعمال کی ۔یعنی جو طالبان سویت یونین کے دور میں ہمارے ساتھ تھے اگر وہ آج بھی ہمارے ساتھ ہیں تو اُن کے خلاف کاروائی نہیں کی جائے گی اور نہ ہی اُن پر جنگی مقدمات عائد ہونگے ۔یہ عام ترکیب نہ تھی اس ترکیب کے اندر بہت سے معنیٰ مخفی تھے جن کو ڈی کوڈ کرنا دقت طلب کام ہے۔

good or bad taliban کی سیاسی اصطلاح اور قلعہ جنگی کے کرداروں کے درمیان گھوڑے کا گوشت کھانے اور نہ کھانے یا حرام اور حلال کی بحث میں بھی علامتی اندازِ فکر موجود ہے ۔جس طرح امریکہ نے Good or bad taliban کی اصطلاح پیدا کر کے نئی صورتِ حال کو جنم دیا تھا اسی طرح قلعہ جنگی کے کرداروں کے درمیان ہونے والی حرام وحلال کی بحث قاری کی توجہ ایک نئی صورتِ حال پر مرکوز کر دیتی ہے ۔ اس سیاسی صورتِ حال کو علامتی تناظر میں دلچسپ انداز سے پیش کیا ہے :

اگر یہ گھوڑا نہیں گدھا ہے تو یہ کیسے ہنہنا سکتا ہے۔

بیوقوف...گھوڑا ہے اور اگر ہم اس کو قابو کر کے تہہ خانے میں لے آئیں

تو اسے کھا سکتے ہیں۔

گھوڑا حلال ہوتا ہے؟

اگر نہیں بھی ہوتا ہے تو کیا تم نہیں کھاؤ گے ...

تم بتاؤ عبدالوہاب خادمین حرمین شریفین ....تم سے بہتر حلال اور حرام کی تمیز کسے ہو سکتی ہے ہم تو تمہارے پیروکار ہیں ...

مکروہ ہے لیکن حرام نہیں ....کھایا جا سکتا ہے ۔(۱۳)

ساتویں علامت میں کمال درجے کی تاثیر اور تجسس ہے جو کہ مصنف کی علامت نگاری کی مہارت کو ظاہر کرتی ہے ۔امریکہ نے اپنے مخفی مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے افغانستان پر بموں کی باش کردی ،ہر طرح کے کیمیائی ہتھیار استعمال کے گئے ڈیزی کٹر جیسے منی ایٹم بم بنکر بسٹر استعمال کیے گئے ۔افغانستان کو لاشوں سے بھر دیا، افغانستان کو لاشوں کے صحرا میں تبدیل کر دیا ،جگہ جگہ گہرے گڑھے پڑ گئے ،ادھڑی اور کٹی پھٹی لاشوں کے کھیت ہر جگہ نظر آتے معصوم افغانیوں کی لاشوں کو سانسی اور گدھوں کی مقابلہ بازی کے لیے چھوڑ دیا گیا تھا کہ ان دونوں میں سے کون پہلے ان کی لاش تک پہنچ کر اپنی خوراک کا حصہ بنائے ۔افغانستان کی سرزمین کو سروں کے فٹ بال سے بھر دینے کے باوجود بھی امریکہ اپنے مخفی مقاصد میں کامیاب نہ ہو سکا ،اور نہ ہی افغانستان پر مکمل طور پر قابض ہو سکا بلکہ سویت یونین کی طرح وہاں سے بچ نکلنے کی ترکیبیں سوچنے پر مجبور ہو گیا۔

بالکل اسی طرح قلعہ جنگی میں گھوڑے کو مار دینے کے بعد وہ گھوڑے کو نہ کھا سکے ،جس طرح امریکہ اور اس کے اتحادی افغانستان کو ہڑپ نہ کر سکے اسی طرح قلعہ جنگی کے کردار مرتضیٰ ،گل شیر ولی، ہاشم میر ،اور جانی بھی گھوڑے کو نہ کھا سکے ۔اس سیاسی علامتی تناظر کو انتہائی بلیغ اور فصیح استعارے کی صورت میں بیان کیا گیا ہے:

گھوڑے کو کیسے اور کہاں سے کھایا جاتا ہے

یارا...گل شیر شاید کوشش کر چکا تھا ۔اس کا جلد تو بہت سخت ہے ،چمڑے کے موافق ہے اس میں دانت گاڑھ کر گوشت کا بوٹی تو الگ نہیں کیا جا سکتا تم نے کوشش کیا ہے خاں صاحب نہیں یارا ...بس ہاتھ لگا کر اندازہ کیا ہے ...چمڑے کے موافق

..کیسے کھائے گا۔(۱۴)

اسی تسلسل کو مزید یوں بیان کیا ہے:

تم اگر مذاق سے فارغ ہو جاؤ تو میں گھوڑے کے پارچے تراشنے کی کوشش کروں اگر چہ یہ مکروہ ہے، مرتضٰی شدید غصے میں تھا، اس جانور کی پشت پر بیٹھے ہوئے کبھی یہ خیال نہیں آیا کی اس کی جلد کا چمڑا اتنا سخت ہوگا کہ اسے ایک خنجر سے کاٹنے کے لیے بھی اتنا زور لگانا پڑے گا ...تم سب خاموش ہو گئے تو میں یہ کوشش دوبارہ کروں گا۔(۱۵)

آخری اور آٹھویں علامت کو بھی بلیغ کنایہ میں پیش کیا ہے۔امریکی حملے کے بعد افغانستان کھنڈر میں تبدیل ہو گیا، زندگی کے تمام آثار ختم ہو چکے تھے، افغانستان میں کسی قسم کی زندگی کی کوئی علامت باقی نہ رہی۔ افغانستان کشف و کرامات کا نمونہ پیش کرتا، جگہ جگہ لاشوں کے پھڑ کنے اور ٹھنڈا ہونے کا عمل جاری تھا۔ یہاں تو لاشوں کے سروں پر چراغ روشن نہ ہوتے تھے، افغانستان بھوت گھر کا منظر پیش کر رہا تھا۔افغانستان اب کسی طرح بھی کارآمد نہ رہا تھا، افغانستان کو ہر طرح سے تباہ و برباد کر دیا گیا تھا۔

افغانستان کی تباہی و بربادی اور گھوڑے کا مردہ جسم جو تہہ خانے میں کبھی پانی کی سطح پر نمودار ہوتا اور کبھی ڈوبکی کھا کر پانی کے نیچے چلا جاتا۔ان دونوں واقعات میں گہری مطابقت پائی جاتی ہے۔نہ تو افغانستان کسی کے کام آسکا اور نہ ہی کسی کام کا رہ سکا، اسی طرح گھوڑے کا جسم بھی کسی کی خوراک کا حصہ نہ بن سکا اور نہ کسی اور کام کا رہا افغانستان کی اس موجودہ صورتِ حال کو استعاراتی انداز میں یوں پیش کیا گیا ہے:

تاریکیوں کے سمندر میں چھ جزیرے ابھرے ہوئے تھے اور ساکت تھے گھوڑے کا ڈھانچہ کبھی جزیرہ بنتا تھا یعنی سطح آب پر نمودار ہوتا تھا اور کبھی ڈوب جاتا تھا اور اللہ بخش تھا جسے وہاب نے تھام رکھا تھا اور وہ بھی ڈوبتا ابھرتا رہتا تھا... چھ جوگی تھے جو اس تاریک گپھا میں دھونی رمائے کھڑے تھے....ان کا ٹھٹھرنا اور کانپنا بھی موقوف ہو چکا تھا اور وہ سردی میں نیلو نیل ہوئے ساکت اور منجمد سے ہو چکے تھے ...رات ہو چکی تھی۔(۱۶)

مستنصر حسین تارڑ نے گھوڑے کے علامتی پیکر میں افغانستان کی سیاسی سماجی معاشی ،عصری اور بحرانی کیفیت کا دلکش مرقع پیش کیا ہے۔

قلعہ جنگی میں گھوڑے کی علامت کے علاوہ اور بھی کئی علامتیں موجود ہیں ،اگر ناول کے عنوان قلعہ جنگی پر غور کیا جائے تو یہ بھی ایک علامتی اور استعاراتی عنوان ہے جو افغانستان کی مضبوطی اور مزاحمت کو ظاہر کرتا ہے ۔امریکی آخری لمحے تک قلعہ جنگی کے اندر داخل ہونے میں کامیاب نہ ہو سکے ،آخری لمحوں میں جب چند امریکی تہہ خانے میں اترے ہیں تو عبدل الحمید جان واکر کلاشنکوف کا ایسا فائر کرتا ہے کہ ایک امریکی زخمی ہو کر لڑھکتا ہوا تہہ خانے کے پانی میں آ گرتا ہے ۔اس آخری لمحے کی صورتِ حال کو نا قابلِ یقین حیرت کے ساتھ یوں پیش کیا ہے:

> وہ بے خطر نیچے اترتے تھے ۔جب عبدل الحمید جان واکر کے مر چکے منجمد بدن کی آنکھوں کے علاوہ ایک انگلی بھی زندہ ہو گئی تھی جو لبلبی پر تھی ،اسے دبانے میں پہروں لگ گئے ،بالآخر وہ دب گئی ...گولیوں کی بار نے سیڑھیوں کا پلستر اڈھیڑ دیا اور ان میں سے دھول بلند ہوئی اور اس دھول میں کوئی زخمی ہو کر گرا اور لڑھکتا ہوا نیچے پانی میں آ گرا... شِٹ ...کسی نے امریکی لہجہ میں تھوکا ،ادھر تو اب بھی کوئی ہے، ہاں میں ہوں ...ڈونٹ کم ڈاؤن آر ،آئی وِل شوٹ ...کرائست ،اسی لہجے میں ایک بے یقین حیرت کا خوف ابھرا۔ یہ تو ہو نہیں سکتا لیکن نیچے ہم سے کوئی ہے ۔نو...آئی ایم ناٹ ون آف یو....میں تم میں سے نہیں۔(۱۷)

ناول کے عنوان میں بھی علامتی دلچسپی کا یہ عنصر موجود ہے کہ ناول بحرانی کیفیت سے شروع ہو کر بحرانی کیفیت پر ہی ختم ہوتا ہے قلعہ جنگی کی علامت کے حوالے سے ڈاکٹر ممتاز احمد اپنی کتاب اردو ناول کے ہمہ گیر سروکار بیان کرتے ہیں:

> کیا ایسا محسوس نہیں ہوتا کہ ”قلعہ جنگی“ علامت ہے ایک ایسی مسلح مزاحمت کا جس کے انجام اور جس کی سچائی کے بارے میں کچھ کہنے سے عقل قاصر ہے۔(۱۸)

قلعہ جنگی کی اس علامت میں افغانستان کی سویت یونین سے لیکر گیارہ ستمبر تک کے تاریکی

ادوار تک کے بھید کو ظاہر کیا گیا ہے

قلعہ جنگی میں ایک اور علامتی جملے کے ذریعے دہشت گردی کے سبب کو یوں عیاں کیا ہے:

ویسے بغاوت کبھی بے جواز نہیں ہوتی ....

جیسے دہشت گردی بھی کبھی بے جواز نہیں ہوتی ۔(۱۹)

قلعہ جنگی کا ایک اور علامتی کوڈ جملے میں یوں بیان کیا گیا ہے کہ ''ویسے سنا ہے کہ چار بطخوں کا خوشی سے کوئی تعلق نہیں، کیا یہ سچ ہے'' (۲۰) (ص ۱۹۵)

اس کو ڈی کوڈ کیا جائے تو شاید اس کا اشارہ پاکستان کے چاروں صوبوں کی طرف بھی ہو سکتا ہے یا پھر کسی انگریزی محاورے اور یا کسی نظم سے اخذ شدہ جملے کا ترجمہ بھی ہو سکتا ہے، کیونکہ یہ جملہ ان کے کئی دوسرے ناولوں میں بھی دوہرایا گیا اس کے علاوہ ایک اور علامت کو ایک آتش پرست کے کردار سے بیان کیا گیا ہے:

آتش پرست کے سامنے مرتبان میں جلتی مقدس آگ کا شعلہ تیز ہوا سے بری طرح پھڑ پھڑایا... یہ شعلہ بھی ایک زمانے میں ایک تصورِ کامل تھا... بیشتر خداوں کی مانند ... بامیان کے بدھ کی مانند ... یہ رات اس آتش پرست بوڑھے کے لیے بھی بے حد طویل ہو رہی تھی جس نے اپنے شعلے کو زندہ رکھنے کی خاطر لاکھوں راتیں گزار دی تھیں ۔(۲۱)

آتش پرست اور آگ کے استعارے میں مذہبی نظریاتی تصادم کی بنیاد پر غیر ملکیوں کا افغانستان میں آگ بھڑکانا ہے یہ آگ قدیم دور سے ہی بھڑکائی جا رہی ہے اور آج کے دور میں بھی گیارہ ستمبر کی صورت میں موجود ہے ۔سوویت یونین کے دور میں بھی یہی سر زمین کارزار بنی تھی اور گیارہ ستمبر کے بعد پھر ایک مرتبہ افغانستان کی سر زمین کو تختۂ مشق بنایا گیا ہے ۔افغانستان کی یہ وہی سر زمین تھی جہاں پہلے کیمیونزم اور اسلام کا تصادم تھا، مگر اب عیسائیت اور اسلام کا تصادم جاری تھا ۔اسی بات کو Samuel P Huntington اپنی کتاب *The Clash of Civilizations* میں بیان کرتے ہیں

The United states,Europe,russia,and India have thus become engaged in a truly globle struggle against

china,Japan,and most of Islam.(22)

خس و خا شاک زمانے میں سیاسی علائم واستعارات کا استعمال

مستنصر حسین تارڑ کا ناول خس و خاشاک زمانے میں مسلمانوں کی سیاسی سماجی تاریخ کو اس کے صحیح تناظر میں پیش کیا ہے ،جس میں ۱۹۳۰ء سے لے کر گیارہ ستمبر کے بعد تک کی سیاسی سماجی اور عصری صورتِ حال کو بیان کیا ہے۔لیکن مستنصر حسین تارڑ نے اس تاریخ کو سیاسی علائم کے روپ میں بیان کیا ہے۔ جس سے دلچسپی کا عنصر بڑھ جاتا ہے

پہلی علامت محمد جہان کا ایک ویرانے میں کنواں کھودوانے کی ہے جو پاکستان کے وجود کی علامت ہے۔کنواں کھودتے وقت بیلچوں اور کدالوں کی آواز تقسیم کے خوف کی علامت کو ظاہر کرتی ہے۔اس حوالے سے مستنصر حسین تارڑ بیان کرتے ہیں:

> تو یہ دھمک زمین میں سفر کرتی دھک دھک کرونڈیے،چھپکلے،اور دیگر رینگنے والوں کو ایک عذاب میں مبتلا کرتی ....یہ کرم داد اور مولا داد کی کدالوالوں میں سے جنم نے رہی تھی جو محمد جہان کے لیے ایک کنواں کھودر ہے تھے ...اُن درجن بھر مصلیوں اور دین دار مزدوروں کے بیلچوں کی زمین میں اترنے کی آواز تھی جو اُن کے معاون تھے(۲۳)

اس علامت میں پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے کو وسیع علامتی تناظر پیش کیا ہے ۱۹۴۷ء میں پاکستان کا وجود ،لاکھوں مسلمانوں کی دھڑکن تھا۔پاکستان کا وجود مسلمانوں کے لیے کسی جنت سے کم نہ تھا۔ کیونکہ برصغیر شروع سے ہی سیاسی اعتبار سے لا قانونیت ،انتشار ،اور افراتفری کا شکار رہا،اس لحاظ سے علامت پرغور کریں تو محمد جہان ایک کنواں کھودوانا چاہتا ہے تا کہ باقی حیاتی امن اور سکون سے رہے سکیں۔

تقسیم سے پہلے پورا ہندوستان چھوٹی چھوٹی ریاستوں اور جاگیروں میں بٹا ہوا تھا،جو ہر وقت آپس میں برسر پیکار رہتی تھیں۔کسی دور میں کنواں کھودوانا آسان نہیں ہوتا تھا۔جو شخص کنواں کھودواتا اُس کے گھر تک کا تمام مال بِک جاتا مگر کنوان مکمل نہیں ہوتا نامکمل رہتا۔اسی طرح پاکستان کا وجود میں آنا کوئی آسان کام نہ تھا۔پاکستان کے وجود میں آنے سے پہلے عام لوگوں نے انگریزوں کے اذیت ناک مظالم برداشت کیے،اس

کے لیے برصغیر کے مسلمانوں نے ۱۸۵۷ء میں سکھوں کی قتل و غارت، ہندوؤں کے مظالم، برہمو سماج، پرارتھنا سماج، دیو سماج، آریہ سماج جیسی تحریکیں، کانگریس کی مسلم دشمنی، اردو ہندی تنازعہ، جلیانوالہ باغ کا ستم، جیسے آگ کے سمندروں کا سامنا کرنا پڑا جو آسان نہ تھا

مستنصر حسین تارڑ نے اس علامت کو کئی ٹکڑوں میں بیان کیا ہے۔علامت کا ایک نیا پہلو اُس وقت قاری کی دلچسپی اور حیرت کو بڑھا دیتا ہے جب کنواں کھودتے وقت کنواں میں سے بہت سے بونے نکل کر ادھر اُدھر کھیتوں میں غائب ہو جاتے ہیں، اور محمد جہان کے بھائی بخت جہان کو تنگ کرتے ہیں۔ بونے بخت جہان کو کئی خدشات میں ڈالتے ہیں، مثلاً جب بخت جہان بونوں کو ڈرا کر بھگانے کی کوشش کرتا ہے تو کنواں کے بونے بخت جہان سے کہتے ہیں:

> چوہدری ہم نے کہیں دفعہ نہیں ہونا....ہم راج کرنے کے لیے آئے ہیں۔اُن میں وہ بونا جو بہت ہی بونا تھا بولا جب تاریخ کٹ پھٹ جائے گی، جغرافیے ادھڑ جائیں گے تب....خلقِ خدا نہیں ہم...بونے راج کریں گے. (۲۴)

یہاں پر یہ علامتی تناظر تلخ ہو جاتا ہے، کیونکہ ان بونوں کا وجود پاکستان بننے کے بعد کی انتہائی دلخراش اور تلخ حقائق کو بے نقاب کرتے ہیں۔ پاکستان کے لیے قربانیاں عام لوگوں نے دیں، اس کی بنیادوں میں اپنے خون اور اعضاء کو شامل کیا لیکن اقتدار اور عیش اُن لوگوں کے ہاتھ آیا جو انگریزوں کی محبت کا دم بھرتے تھے اور اُن کے پاؤں دھونے کو بڑا فخر سمجھتے۔ یہ لوگ محمد جہان کے کنویں کے بونوں کی طرح کئی گرہوں میں تقسیم تھے۔ ان لوگوں کی وسیع ملکیتوں کا آغاز ۱۸۵۷ء ہی میں شروع ہو گیا تھا۔ پاکستان میں یہ اپنے مفاد کے لیے بڑے ہی موثر اور کارآمد طریقے سے کام کر رہے ہیں۔زرعی اصلاحات کے پس منظر میں اے، آر شبلی اپنی کتاب پاکستان کے دیہہ خدا میں اس علامتی تناظر کو صاف لفظوں میں بیان کرتے ہیں:

> پاکستان میں زرعی اصلاحات کے نفاذ کی تین مرتبہ کوشش ہو چکی ہیں۔آخر کار کیا وجہ ہے کہ نتیجہ خاطر خواہ نہیں نکل سکا، اور زرعی لحاظ سے پاکستان آج بھی دوسرے ممالک کے مقابلے میں اتنا ہی پسماندہ ہے جتنا پہلے تھا۔میرے نزدیک اس کی وجہ بجز اس کے کچھ نہیں کہ زرعی اصلاحات وضع کرتے وقت پسماندگی کے بنیادی

> اسباب پر غور نہیں کیا جاتا۔ پاکستان اگر زرعی لحاظ سے پھسڈی ہے تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ یہاں عمدہ بیج اور کیمیائی کھاد اور کرم کُش ادویہ استعمال نہیں کی جاتیں، بلکہ یہ ہے کہ ستر فیصد مزروعہ اراضی پر بالواسطہ یا بلاواسطہ پرانے جاگیردار، اور نو دولتیئے قابض ہیں جن کو زراعت سے اس کے سوا کوئی دلچسپی نہیں کہ وہ مزدوروں کے خون سے اپنا چراغ اقتدار روشن کرتے رہیں۔ بدقسمتی سے اب تک جتنی حکومتیں برسر اقتدار آئیں وہ عوام کی نہیں، مفاد پرست طبقہ کی نمائندگی کرتی رہیں۔ انہوں نے پرانا نظام قائم رکھنے کے لیے نوکر شاہی، عسکریت اور بیرون ملک کی استعمار پسند طاقتوں کا سہارا لیا۔ نتیجہ ظاہر ہے زرعی اصلاحات کے نام پر جو بھی قدم اٹھایا گیا اس کا فائدہ خود برسر اقتدار طبقہ کے سوا کسی کو نہ پہنچ سکا۔ (۲۵)

اس علامت میں ابن الوقت کرداروں کو ظاہر کیا گیا ہے۔ اور آج اگر پاکستان کے سیاسی منظر نامے کو دیکھیں تو بات پوری طرح عیاں ہو جاتی ہے۔ یہ علامت صادق ہے۔ اس کے بعد اسی علامت کے تسلسل کو آگے بڑھایا ہے جس سے یہ علامتی تناظر اور بھی زیادہ عیاں ہو جاتا ہے امیر بخش، عزیز جہاں سے بحث کرتے ہوئے کہتا ہے:

> مجھے بابا جناح کی نیت پر کچھ شبہ نہیں ہے... مجھے تو حیرت ہوتی ہے عزیز کہ ہم مسلمانوں میں انصاف اور انسانیت پرست، قانون کی حکمرانی چاہنے والا، منظم اور تعصب سے پاک ایک ایسا شخص بھی پیدا ہو سکتا ہے.... لیکن اُس کے سنگی ساتھیوں پر تو نظر کرو جو بقول اُس کے سب کے سب کھوٹے سکے ہیں، وہی جو لوگوں کو ذلتوں سے مار دینے والے ہوتے ہیں.... وہ چلا گیا تو پھر اُس کے خلاء کو پُر کرنے کون آئے گا.... ہمارے پیغمبر کے انقلاب کے بعد جس کی بنیاد ہی مظلوموں اور مفلسوں پر رکھی گئی تھی یزید اور شمر آ گئے تو مجھے خدشہ ہے کہ مسلم لیگ میں دھڑا دھڑ شامل ہونے والے وڈیرے، جاگیردار، فتح مکہ کے بعد مصلحتاً ایمان لانے والے بابے جناح کے رخصت ہونے پر یزید اور شمر ہو جائیں گے اور ایک کربلا میں ہم

> جیسوں کے خون کے پیاسے ہو جائیں گے ....بونے ہم پر راج کریں گے (۲۶)۔

اس علامت میں مزید دو تلخ حقائق بیان کر دیے گئے ہیں، یعنی مصلحتاً تحریک پاکستان میں شامل ہو کر پاکستان بننے کے بعد اقتدار پر قابض ہو گئے ، بونوں کا راج قائم ہو گیا اور اس کے بعد عام عوام کے خون کے پیاسے ہو گئے ۔ برسرِ اقتدار طاقتوں کا عوام کے ساتھ رویے کو سٹیفن ، پی، کوہن ، اپنی کتاب پاکستان کا مستقبل میں بیان کرتے ہیں :

> قزلباش اور دوسروں کا خیال ہے کہ پاکستانی حکومت اور اشرافیہ تعلیم کو اپنے لیے اور ریاست پر اپنے کنٹرول کے لیے خطرہ سمجھتی ہے ۔انہوں نے اس جانب بھی توجہ دلائی کہ پاکستان کی ایک نسل ضائع ہو چکی ہے ، جیسے 2002ء میں اصلاحاتی کاوشوں سے کوئی فائدہ حاصل نہ ہوا ۔ان کے الفاظ میں ایک نتیجہ یہ نکلا ہے کہ وہ جنہیں ریاعتیں نہ مل سکی تھیں ، ہمیں سزا دینے کے مختلف طریقے تلاش کر رہے ہیں ۔(۲۷)

اس کے بعد مستنصر حسین تارڑ نے انڈیا پاکستان کی تقسیم اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے خون خرابے کو بسنت کے علامتی تناظر میں بیان کیا ہے ۔لاہور کے آسمان پر بسنت کے تناظر میں تقسیم اور خون خرابے کی منظر نگاری ان الفاظ میں کی گئی ہے:

> لہولہان ہو چکی سوہن سنگھ کی اُنگلیوں میں سے سرکتی ڈور یکدم تن گئی ...وہاں عرش کی بلندیوں میں اوجھل اُس کے لکھنو کاٹ گڈے کو تیز ہوا نے سیدھا تیر کر کے عرشوں سے بھی پار کر دیا تھا اور وہ ڈور تن گئی تھی ...اُس کی زخمی اُنگلیوں کے اندر وہ ڈور گھاؤ ڈالتی سرکتی گئی اور پھر یکدم ٹوٹ گئی ...اُس کے ہاتھوں میں ڈور کا ایک بے جان سرا لٹک گیا ...اُس کا لکھنو کاٹ گڈا کٹ چکا تھا ...جس ڈور سے وہ بندھا ہوا تھا وہ ٹوٹ گئی تھی ، وہ بے آسرا اور بے وطن ہو چکا تھا (۲۸)

ان علامتوں میں مستنصر حسین تارڑ نے تقسیم ہند کے وقت کے کرب کو سیاسی علائم کے پردوں میں بیان

کیا ہے ۔سوہن سنگھ کی انگلی کا کٹنا تقسیمِ ہند کے خونی فسادات کو ظاہر کرتا ہے ۔اور ڈور کا بے آسرا سر اوطن کے گہرے گھاو کی طرف اشارہ ہے ۔ان علامتوں سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ عام لوگوں کی قتل و غارت کسی نہ کسی جبر کے تحت ہوتی ہے ۔اس کے علاوہ لاہور کے آسمانوں پر پتنگوں کا کٹنا برصغیر کے ٹکڑے ٹکڑے ہونے کو ظاہر کرتا ہے۔تقسیم ہند اور اس کے بعد کی ساری صورتِ حال کی داستان کو ممتاز احمد اپنی کتاب اردو نـاول کـے چند اہم زاویے میں یوں بیان کرتے ہیں :

> خس و خاشاک زمانے ، پڑھنے کے بعد اندازہ ہوا کہ ہمارا ذہین ناول نگار تاریخ اور وقت سے چھٹکارا حاصل نہیں کرسکتا ،شاید اُس کی وجہ یہ ہو کہ ہماری تاریخ تقسیمِ ہند سے جڑی ہوئی زندگی سے اکھڑ جانے ،مسلم اور غیر مسلم تعلقات ،غیر ملکی فاتحین کا ہندستان میں آنا ،نو آبادیاتی دور ،مغلیہ سلطنت کا خاتمہ ،،دو قومی نظریے کا پرچار ،ہندو مسلم آویزش کے عوام الناس کے اذہان پر اَن مٹ اثرات ،تہذیبی کایا کلپ، پاکستان کی تخلیق ،کم علمی کے باعث ضعیف الاعتقادی،تنگ نظری ،تو ہم پرستی ،اور جاہلانہ عقائد ،اور مختلف النوع تعصبات کی مشترکہ داستان لکھی ہوئی ہے (۲۹)

اس کے بعد مستنصر حسین تارڑ نے تقسیم کے وقت عام لوگوں کی قتل و غارت کو بھی علامتی انداز میں بیان کیا ہے ۔فسادات کے دوران انسانی رشتہ کی تمیز کھوگئی ،لوگ ایک دوسرے سے بچھڑ گئے ،لاکھوں لوگوں کو جلا کر راکھ بنا دیا گیا ،خون کی ندیاں بہا دی گئی ،بے بس اور بے گناہ عورتوں اور دودھ پیتے بچوں کو درندگی کا نشانہ بنایا گیا ،اب لوگوں کے درمیان نہ تو گاندھی تھا اور نہ قائداعظم ،بس بے سہارا معصوم لوگ تھے ،جن کو قتل کیا جا رہا تھا۔اس فسادات کو علامتی انداز میں مستنصر حسین تارڑ نے بابا دھیان سنگھ کی زبان سے نکلنے والے جملے سے ظاہر کیا ہے ۔فسادات کے دوران ویران گلیوں میں تنہا پھرتے ہوئے دھیان سنگھ خالی گھروں کی نگرانی کر رہا ہے جو ایک نیم پاگل سکھ ہے جب سوہن سنگھ ان ویران گلیوں میں اپنے رشتہ داروں کو تلاش کرنے آتا ہے تو بابا دھیان سنگھ ان سے بات کرتے ہوئے کہتا ہے :

> وہ سب اپنے ویہڑے ویران کرکے ...گلیوں کو سُونا کرکے چلے گئے ہیں .... پر کہاں بابا اُنہوں نے گورود وارے گھر بنا لیے ہیں ....اُس کے پاٹک پر جا کر

> دستک دے وہ بے تابی سے گورودوارے کی جانب اُٹھتی ہوئی تنگ گلیوں کی جانب مڑا .... بابا دھیان سنگھ بھی پلٹا اور سناٹے میں آئی ہوئی گلی کی پکی اینٹوں پر اُس کی لاٹھی کے ٹیکنے سے ٹک ٹک کی جو آواز کی ارتعاش آئی تھی وہ گونجتی کوٹ ستارہ کے آسمانوں تک جاتی بابا وہ رک گیا .. آپ کیوں نہیں گئے .. آپ ان ویران گلیوں میں تنہا کیوں رہے گئے ہو؟ میں راکھی کرر ہا ہوں سوہن سنگھ ....مت مارونینوا کے تیر۔(۳۰)

اس کے بعد مستنصر حسین تارڑ نے چار مرغابیوں والی حیران کن مبہم اور پہیلی کی صورت جیسی علامت بیان کی ہے:

> اُس کے گھٹنے اور اُنگلیوں کے جوڑوں میں ستمبر کی سرد ہوا سرائت کرتی تھی اور اُن میں خوابیدہ دردوں کو جگاتی تھی ....شب کے اندھیارے میں اُس نے آنکھیں میچ کر نہایت دھیان سے اپنے سامنے پھیلے جوہڑ کے پانی میں ڈولتی آخری مرغابیوں کو شمار کیا وہ تعداد میں صرف چار تھیں اُس نے ایک ایک کر کے اُنہیں پھر سے گنا صرف چار رہے گئی تھیں کیا میں خوش ہوں ؟اس نے اپنے آپ سے پوچھا چار مرغابیوں کا خوشی سے کوئی تعلق نہیں ۔جواب آیا ،اور دھول میں اٹا ہوا جواب آیا۔(۳۱)

مستنصر حسین تارڑ نے اس علامت کو اپنے دوسرے ناولوں ،قلعہ جنگی ،راکھ ،میں بھی بیان کیا ہے ۔اس علامت پر غور وفکر کیا جائے تو ذہن میں چار صوبوں کا بھی تصور آتا ہے ۔یہ سب سے حیران کن علامت ہے اور ایک ایسا وسیع استعارہ ہے جس کو سمجھنے کے لیے کئی اور واسطے درکار ہوں ۔اس علامت میں ماضی کے کسی اندوہناک دکھ یا واقعہ کا بھی کرب محسوس ہوتا ہے ۔خس و خاشاک زمانے میں ایک اور علامت 9/11سانحہ کی ہے ۔گیارہ ستمبر ایک علامت ہی نہیں بلکہ ایک عظیم سیاسی استعارہ ہے ۔استعارہ اس لحاظ سے ہے کہ گیارہ ستمبر امریکہ اور مغربی پالیسی سازوں کی کئی سالوں پر مشتمل پوشیدہ پلاننگ اور سازش ہے ،جس میں امریکہ کے بہت سے عالمی سیاسی مخفی حقائق چھپے ہوئے ہیں ۔مستنصر حسین تارڑ 9/11 کے سانحہ کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

> مخروطی زرد رنگ کی آہنی ٹوپیاں پہنے ...ایک اضطراب کی حالت میں نیویارک فائر

> بر یگیڈ کے فائر مین اپنے خوف کو ڈھانپنے کے لیے بلند آوازوں میں ایک دوسرے کو پکارتے ڈھارس دیتے ٹریڈ سنٹر کی اس عمارت کی جانب بڑھتے جس کے دل میں ابھی ابھی ایک جیٹ طیارہ پیوست ہوا تھا اور وہ اُس کے دھچکے کی شدت سے اپنے قدموں پر گرتی جاتی تھی ...اُن کی بے یقین آنکھوں کے سامنے مسمار ہو رہی تھی اور اُس میں سے دھول کا ایک غبار اٹھ رہا تھا ... پوری ایک سو دس منزلیں یونہی آسانی سے تنہائی میں مسمار نہیں ہوتی اُن میں مقیم ہزاروں بے گناہ لوگ بھی اُن کے ملبے کے اندر زندہ مدفون کرتے چلے جاتے ہیں ....اور پھر فوراً ہی غیب سے ایک اور طیارہ نمودار ہوا اور ٹریڈ سنٹر کی دوسری جڑواں عمارت کے قلب کے اندر چلا گیا۔(۳۲)

مستنصر حسین تارڑ نے 9/11 سانحہ کے پسِ پردہ عالمی سیاسی تناظر کو بیان کیا ہے جس کی بنیاد پر تہذیبوں میں تصادم برپا کر کے معدنی ذخائر اور تیل پر قبضہ کرنا ہے۔اس کے علاوہ گیارہ ستمبر کی علامت کے پس منظر میں مغربی لوگوں کا مسلمانوں کے ساتھ نفرت انگیز رویہ ،مسلمانوں کی دربدری ،مسلمانوں کو امریکہ چھوڑ دینے کے نوٹس ،مسلمانوں کی اندھا دھند گرفتاریاں ،امریکہ میں چھوٹی موٹی مزدوریاں کرنے والوں کا تعاقب ،لاکھوں لوگوں کی اپنے گھروں سے بے دخلی ،افغانستان اور عراق پر امریکی حملے ،افغانستان کی تباہی وبربادی ،جس سے عالمی سطح پر تہذیبوں کا تصادم کو بیان کیا ہے۔اسی تصادم کو Samuel P Huntington اپنی کتاب *The Clash of Civilizations* میں بیان کرتے ہیں

> The underlying problems for the west is not Islamic fundamentalism.It is Islam,a different civilization whose people are convinced of the superiority of their culture and are obsessed with the inferiority of their power. The problem for Islam is not the C I A or U S department of defense.It is the west,a different civilization whose people are convinced of the universality of their culture and believe that their superior,if declining,power imposes on them the obligation to extend that culture throughout world.These are the basic ingredients that fuel conflict

between Islam and the west(33)

اس علامت میں مستنصر حسین تارڑ مسلمانوں کی خصوصاً افغانیوں کی برس ہا برس کی غفلت ، بے حسی ،اور نالائقی کو بھی بیان کیا ہے جس کا خمیازہ اکیسویں صدی کے مسلمانوں کو بھگتنا پڑ گیا ،جبکہ دوسری طرف امریکہ اپنی جدید ٹیکنالوجی کے بل بوتے پر مسلمانوں کی تہذیب وتمدن کے پرخچے اڑانے ،مسلمان مرد ، بچے، عورتوں اور بوڑھے لوگوں کی ہلاکت ،قندھار،غزنی ،بغداد ، کی تباہی و بربادی ،اور مسلمانوں کی توانائی کے ذخائر پر قبضے کو عالمی سیاسی استعارے کے طور پر پیش کیا ہے ۔اس حوالے سے ڈاکٹر مجاہد کامران اپنی کتاب پسِ پردہ:عالمی سیاست کے مخفی حقائق میں بیان کرتے ہیں:

> دنیا میں تیل کی بڑھتی ہوئی مانگ اور سرعت سے گھٹتے ہوئے ذخائر بڑی تیزی کے ساتھ بنی نوع انسان کو ایک انتہائی خطرناک صورتِ حال کی طرف دھکیل رہے ہیں ۔تیل کے بے دریغ استعمال کی امریکی عادات اور دنیا کے تمام تر وسائل پر مغرب کے دولت مند ترین خاندانواں کی قابض ہونے کی خواہش نے بنی نوع انسان کے وجود کو خطرے میں ڈال دیا ہے۔مشرقِ وسطی میں جنگ ،وسطی ایشیاء امریکی موجودگی ،گلوبلائزیشن ،اور نیو ورلڈ کی اصطلاحیں ،دہشت گردی ،القاعدہ کا پراسرار وجود ،عالمِ اسلام کے خلاف پروپیگنڈہ اور امریکی میں شہری آزادی کی سرعت سے سلبی تمام ایک بنیادی مقاصد کے حصول کے لیے ہیں ۔(۳۴)

مستنصر حسین تارڑ کا یہ عالمی استعارہ اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ آئندہ مسلمانوں کو مزید تباہی و بربادی سے بچنا ہے تو مسلمانوں کو علم کے حصول وتحقیق اور جدید ٹیکنالوجی میں آگے بڑھنا ہوگا ورنہ 9/11 کا استعارہ بار بار مختلف ناموں سے دوہرایا جائے گا ۔

خس و خاشاک زمانے میں آخری علامت نئے آدم کی تلاش ہے ۔ناول کا انتساب بھی عطار کے پرندوں اور نئے آدم کے لیے ہے ۔ نئے آدم کے اس تصور کے پیچھے ایک طویل جہدِ مسلسل اور عالمی سیاسی مذہبی تنگ نظری موجود ہے ۔انعام اللہ کی ہجرت کا جو سفر مذہبی تنگ نظری سے گرو مانگٹ کی مسجد سے شروع ہوا تھا وہ در در کی ٹھوکریں ،تقسیم اور فسادات کا دریا ،ضیاء الحق کے کوڑوں کو سہتا ہوا ،جلاوطنی کا عذاب برداشت کرتے

،گیارہ ستمبر کی ہولنا کیوں کے بعد انعام اللہ کی دوسری ہجرت کے بعد انعام اللہ اور شباہت کا نئے آدم کی تخلیق کی سوچ پر ختم ہوتا ہے ۔وہ نہ صرف ایک نیا آدم تخلیق کرنا چاہتے ہیں بلکہ ایک نئے سماج کی تخلیق بھی چاہتے ہیں ، جہاں عقیدوں کی کوئی مالا نہ ہو ،تعصب و تنگ نظری کا شائبا تک نہ ہو ،بم بارود نہ ہواور سب سے بڑھ کر یہ کہ انسان کی نام نہاد ہولنا کیوں کی جنگ اور قتل و غارت گری نہ ہو ۔انعام اللہ شباہت سے کہتا ہے :

> انعام اللہ کی ہتھیلی شباہت کے فی الحال ہموار پیٹ پر اتری ،اُس کے اندر ایک کونپل کی جو دھک دھک دھڑکن تھی اُسے محسوس کیا...اور اُس نے کہا...چلو اس دنیا کو دوبارہ آباد کرتے ہیں ۔(۳۵)

یہ علامت نئے سماجی رشتوں کی حقیقت ،انسانوں کی بے بسی ،عام لوگوں تک انصاف کی عدم فراہمی ،اور مسلسل خواب بننے کو بھی ظاہر کرتی ہے ،ان خوابوں کے پورے ہونے یا نہ ہونے کا سوال پھر بھی باقی رہتا ہے ۔اور نہ ہی خواب پورے ہونے کی چنگاری موجود ہے جو خواب کے پورے ہونے کی آس امید ہو ۔اس حوالے سے ڈاکٹر ممتاز احمد اپنی کتاب اردو ناول کے چند اہم زاویے :اضافوں کے ساتھ میں بیان کرتے ہیں :

> اب جہاں تک دوسرے سوال کا تعلق ہے کہ کیا تارڑ کے نئے آدم کے تصور سے بحوالہ انعام اللہ اور شباہت اتفاق کیا جا سکتا ہے تو پہلی بات ذہن میں یہ آتی ہے کہ عام طور پر ادب برائے زندگی کے حامی ناول نگاروں نے نئے سماجی معاشی اور سیاسی سسٹم کی اپنے اپنے ماجرے کے بین السطور حمایت کی ہے تا کہ دکھوں اور غموں میں گھرے انسان کو ان میدانوں میں انصاف مل سکے ۔مسئلہ یہ ہے کہ تشکیک اور خواب کے بھنور میں گرفتار ہمارے خطے کے لوگ مستقبل کے بارے میں تو یقین سے تو کچھ نہیں کہہ سکتے ۔بہتر ہے کہ ہم اسے اپنے آنے والے وقت پر چھوڑ دیں ۔(۳۶)

کنواں کھدوانا، کدالوں کی دھک دھک کی آواز ،سوہن سنگھ کی پتنگ اور اُنگلی کا کٹنا ،مت مارو نینوا کے تیر، چار ماغابیوں کا خوشی سے تعلق ، 9/11 اور نئے آدم کی تلاش جیسی علامتیں ،کنایے،استعارے مستنصر حسین تارڑ کے تخلیقی اظہار کا منہ بولتا ثبوت ہیں ۔

حوالہ جات

1۔ سہیل احمد، خان، ڈاکٹر محمد سلیم الرحمٰن، منتخب ادبی اصطلاحات، سویرا آرٹ پریس، لاہور، سن، ۲۰۰۵ء، ص، ۱۹۷

2۔ مستنصر حسین تارڑ، قلعہ جنگی، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، سن، ۲۰۰۸ء، ص، ۵

3۔ ایضاً، ص، ۳۷، ۳۸

4۔ نوم چومسکی، گیارہ ستمبر، مترجم، سید کاشف رضا، شہرزاد، کراچی، سن، ۲۰۰۴ء، ص، ۹۶

5۔ ثروت جمال، اصمعی، دہشت گردی اور مسلمان، انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی، اسلام آباد، سن، ۲۰۰۸ء، ص، ۱۰

6۔ مستنصر حسین تارڑ، قلعہ جنگی، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، سن، ۲۰۰۸ء، ص، ۳۹، ۴۰

7۔ مستنصر حسین تارڑ، خس و خاشاک زمانے، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، سن، ۲۰۱۳ء، ص، ۱۵۶

8۔ مبشر حسن، شاہراہِ انقلاب، جلد دوئم، شناخت پبلشر، لاہور، سن، ۲۰۱۲ء، ص، ۱۹۱

9۔ ارون دھتی رائے، سرمایہ داریت، ریاستی جبر اور مزاحمت، مترجم، امجد نذیر، سوجھلا، ملتان، سن، ۲۰۱۲ء، ص، ۸۳

10۔ نجیبہ عارف، 9/11 اور پاکستانی اردو افسانہ، پورب اکادمی، اسلام آباد، سن ۲۰۱۱ء، ص، ۱۱، ۱۲

11۔ مستنصر حسین تارڑ، قلعہ جنگی، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، سن، ۲۰۰۸ء، ص، ۵۰

12۔ ایضاً، ص، ۱۰

13۔ ایضاً، ص، ۶

14۔ ایضاً، ص، ۸۱

15۔ ایضاً، ص، ۸۲

16۔ ایضاً،ص،۱۹۸،۱۹۹

17۔ ایضاً،ص،۲۱۵

18۔ ممتاز احمد،خان،ڈاکٹر،اردو ناول کے ہمہ گیر سرو کار،فکشن ہاؤس،لاہور،سن،۲۰۱۲ء،ص،۶۹

19۔ مستنصر حسین تارڑ،قلعہ جنگی،سنگِ میل پبلی کیشنز،لاہور،سن،۲۰۰۸ء،ص،۶۱

20۔ ایضاً،ص،۱۹۵

21۔ ایضاً،ص،۲۱۰،۲۱۱

22. Samuel p huntington,*The clash of civilizations*, penguin book, new york,1996,p 315

23۔ مستنصر حسین تارڑ،خس و خاشاک زمانے،سنگِ میل پبلی کیشنز،لاہور،سن،۲۰۱۳ء،ص،۵۰

24۔ ایضاً،ص،۱۵۱

25۔ اے،آر،شبلی،پاکستان کے دیہہ خدا،آتش فشاں،لاہور،سن،۲۰۰۹ء،ص،۹،۱۰،

26۔ مستنصر حسین تارڑ،خس و خاشاک زمانے،سنگِ میل پبلی کیشنز،لاہور،سن،۲۰۱۳ء،ص،۲۶۹

27۔ سٹیفن پی کوہن،پاکستان کا مستقبل، مترجم،ہما انور،جمہوری پبلیکیشنز،سن،۲۰۱۱ء،ص،۴۲

28۔ مستنصر حسین تارڑ،خس و خاشاک زمانے،سنگِ میل پبلی کیشنز،لاہور،سن،۲۰۱۳ء،ص،۲۷۲

29۔ ممتاز احمد،خان،ڈاکٹر،اردو ناول کے چند اہم زاویے،انجمن ترقی اردو،کراچی،سن،۲۰۰۳ء،ص، ۲۶۸

30۔ مستنصر حسین تارڑ،خس و خاشاک زمانے،سنگِ میل پبلی کیشنز،لاہور،سن،۲۰۱۳ء،ص،۳۰۹

31۔ ایضاً،ص،۴۷۸

32۔ ایضاً،ص،۲۱۸،۲۱۹،

33. Samuel P Huntington,*The Clash of Civilizations*, penguin book, new york,1996,p,217,218

34۔ مجاہد کامران،ڈاکٹر،پسِ پردہ :عالمی سیاست کے مخفی حقائق،سن،۲۰۱۱ء،ص،۲۱

35۔ مستنصر حسین تارڑ،خس و خاشاک زمانے ،سنگِ میل پبلی کیشنز،لاہور،سن،۲۰۱۳ء،ص،۴۰۷

36۔ ممتاز احمد،خان،ڈاکٹر،اردو ناول کے چند اہم زاویے ،انجمن ترقی اردو،کراچی،سن،۲۰۰۳ء،ص،۲۶۸

مجموعی جائزہ وسفارشات

۱۱ستمبر ۲۰۰۱ء کو وقوع پذیر ہونے والے والا بد ترین سانحہ امریکہ کے لیے کسی قیامت سے کم نہ تھا۔ 11 ستمبر کو دو اغوا شدہ طیاروں کو امریکہ کے شہر نیو یارک میں ورلڈ ٹریڈ سنٹر سے ٹکرایا گیا۔ جس سے چند منٹوں میں 110 منزلہ عمارت زمین بوس ہوگئی۔ اور اسی طرح ایک اور طیارے کی مدد سے پینٹا گون کو بھی نشانہ بنایا گیا، جس کے نتیجے میں وہ بھی تباہ ہوگیا۔ ان طیاروں اور عمارتوں سے بڑے پیمانے پر جانی و مالی نقصان ہوا۔

9/11 کے سانحہ کے بعد مسلم اور غیر مسلم ممالک کا ردِعمل آنا شروع ہوگیا۔ پوری دنیا نے اس حادثے کی مذمت کی، اور اس سانحہ پر گہرے افسوس کا اظہار کیا۔ بہت سے مسلم ممالک نے فوری طور پر مدد کے لیے اپنی خدمات پیش کرنے کے لیے کہا گیا جن کا کوئی خاطر خواہ جواب نہ دیا گیا اور ہر طرح سے نظر انداز کیا گیا۔ اس حوالے سے سب سے زیادہ دباو پاکستان پر ڈالا گیا۔ اس وقت کے فوجی حکمران جنرل پرویز مشرف نے فوراً اس واقع کی بھر پور مذمت اور ملامت کی۔ پرویز مشرف نے اس واقع کے فوراً بعد امریکہ کا دورہ کیا اور 9/11 کے سانحہ کا بھر پور جائزہ لیا، اور امریکی صدر بش سے ملاقات کر کے اپنی طرف سے ہر قسم کی مدد کی یقین دہانی بھی کرائی۔ لیکن امریکی حکام نے ان تمام باتوں کو نظر انداز کیا اور پرویز مشرف کو دھمکی آمیز لہجے میں کہا کہ اگر ہمارا ساتھ نہ دیا گیا تو ہم آپ کو یعنی پاکستان کو پتھر کے دور میں پہنچا دیں گے، اس حوالے سے امریکی حکام کا ردِعمل بڑا ہی جاہانہ رہا۔

امریکی حکومت نے جب تمام یورپی ممالک کو اپنے ساتھ ملا لیا اور اس حوالے سے تمام تیاریاں مکمل کر لیں تو امریکہ نے باقاعدہ جنگ کا اعلان کر دیا، اور کہا کہ آج سے عیسائیت اور اسلام کی جنگ ہے۔ جس سے ساری دنیا میں ایک ہلچل مچ گئی۔

اکیسویں صدی کے سانحہ 9/11 نے زندگی کے دیگر ہائے شعبہ پر بڑے گہرے اثرات مرتب کیے ہیں، اس سانحہ کے اردو ادب پر بھی بڑے گہرے اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ اردو شاعری اور فکشن دونوں میں سانحہ 9/11 اور اس کے اثرات کو بخوبی بیان کیا ہے۔

اردو شاعری میں شاعروں نے سانحہ 9/11 کے واقع، اس میں لوگوں کی ہلاکت، اور اس کے بعد امریکہ اور یورپ کا افغانستان اور عراق پر حملہ، معصوم لوگوں کا اجتمائی قتل، یورپی لوگوں کا مسلمانوں سے نفرت انگیز رویہ، اُسامہ بن لادن کی ایبٹ آباد میں شہادت کی خبر، پاکستان میں بم دھماکوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ، غیر یقینی

صورتِ حال،مشکوک افراد کی حراست،لوگوں کی گمشدگی،قبائلی علاقوں میں فوجی آپریشنز،سکول ،کالج،اور یونیورسٹیوں پر خودکش حملوں کا سلسلہ، یہ سب اردو شاعری کے موضوعات ہیں ۔اس حوالے سے غلام حسین ساجد کی نظم ''ڈیزی کٹر'' بہت اہم ہے جس میں ڈیزی کٹر جیسے منی ایٹم بم کے تباہی اور ہولنا کیوں کو بیان کیا ہے۔ثروت زہرا کی نظم ''ایک اور فتح کے بعد'' میں کلسٹر بموں کی تباہی کی داستان بیان کی ہے،اور امید کا پہلو بھی بیان کیا ہے کہ اس فتح کے بعد ہم پھر سے ایک اور جہاں بسا لیں گے،اقبال احمد شمیم کی نظم ''گیارہ ستمبر'' میں نیویارک کے شہر میں ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی عمارتوں کی تباہی اور اس میں بے گناہ لوگوں کی ہلاکت،کو بیان کیا ہے اور شاعر نے اس سانحہ میں ہلاک ہو جانے والوں کے لیے گہرے دکھ کا اظہار کیا ہے۔اس کے بعد ذی شان ساحل کی کتاب جنگ کے دنوں میں بہت اہم ہے۔ان کی نظموں میں ''ہمارے پاس''،''ہتھیار''،''ہمیں عراق کو''،''جو آواز کسی تک نہیں پہنچ رہی ہے''،''یہ نظم''،''نازک الملائکہ کے لیے''،''ورلڈ آرڈر''،''صدام حسین کے لیے'' ''صدام حسین نظم لکھتا ہے''،''الجزیرہ خاموش ہو جائے گا'' سانحہ 9/11 کے حوالے سے بہت اہم ہیں ۔اس کے بعد احمد ندیم قاسمی کی نظم ''عراقی عوام کا نوحہ'' ایک مشہور نظم ہے جس میں شاعر نے سانحہ 9/11 کے حوالے سے عراقی اور امریکی عوام کے تضادات کو بیان کیا ہے۔

شاعری کے بعد اردو افسانے میں بھی سانحہ 9/11 کے اثرات کو عمدہ انداز میں بیان کیا ہے ۔اس حوالے سے افتخار نسیم کا افسانہ ''پردیسی'' اہم ہے جس میں اسلم کے مرکزی کردار کے ذریعے یورپی لوگوں کا نفرت انگیز رویے کی نشاندہی کی ہے ۔علی حیدر ملک کا افسانہ ''دہشت گرد چھٹی پر ہیں'' ایک اچھا افسانہ ہے جس میں قانون نافذ کرنے والے اداروں پر سخت تنقید کی ہے اور سانحہ 9/11 کے بعد عام آدمی کو درپیش آنے والے مسائل کو بیان کیا ہے۔اس کے بعد الطاف فاطمہ کا افسانہ ''دید وا دید'' ہے جس میں عراق کی تباہ کاریوں کی داستان رقم کی ہے ۔انور زاہدی کا افسانہ ''یہ جنگل کٹنے والا ہے'' جو بغداد کے پس منظر میں لکھا گیا ہے۔مسعود مفتی کے افسانے ''شناخت'' پر بھی گیارہ ستمبر کے نمایاں اثرات ہیں جس میں امریکہ میں مقیم پاکستانیوں پر سانحہ 9/11 کے اثرات کو بیان کیا ہے ۔اس کے علاوہ جن افسانہ نگاروں نے 9/11 کے سانحہ کو موضوع بنایا ہے ان میں مصطفیٰ کریم،نیلوفر اقبال،بیبین مرزا،زاہدہ حنا،پرویز انجم،محمد حمید شاہد،اور محسنہ جیلانی کا نام قابلِ ذکر ہیں ۔

ناول بھی اپنے دور کا بڑا مبصر رہا ہے۔اکیسویں صدی کے عظیم سانحہ 9/11 اردو ناول کا بھی موضوع رہا

ہے۔اس حوالے سے مستنصر حسین تارڑ کا ناول خس و خاشاک زمانے بہت اہمیت کا حامل ہے،جس میں 1930ء سے لے کر گیارہ ستمبر تک کی صورتِ حال کو پیش کیا گیا ہے۔اس ناول کے پلاٹ اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ اس میں سانحہ 9/11 کا تذکرہ بہت ہی دلکش انداز میں میں بیان کیا گیا ہے،جس میں مختلف تکنیک کو بھی برتا گیا ہے۔اس کے پلاٹ میں ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی تباہی اور اس کے بعد امریکہ کا افغانستان اور عراق پر حملہ کو بڑے ہی دکھ بھرے انداز میں بیان کیا ہے۔اس کے بعد ان کا دوسرا ناول قلعہ جنگی ہے۔اس ناول کی کہانی کو قلعہ جنگی کے تہہ خانے کی تکنیک اور گھوڑے کی علامت سے سات کرداروں کی مدد سے بیان کیا گیا ہے جو مختلف مما لک اور رنگ و نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔یہ سات مجاہد امریکہ سے لڑنے افغانستان آتے ہیں اور اسی تہہ خانے میں شہید ہوتے ہیں۔

سانحہ 9/11 کے حوالے سے تیسر ناولٹ محسنہ جیلانی کا میں دہشت گرد ہوں؟

اس ناول میں بیانیہ انداز میں بتایا گیا ہے کہ سانحہ 9/11 کے بعد کس طرح برطانیہ میں مقیم لوگ متاثر ہوئے۔سانحہ 9/11 کا بعد برطانیہ میں فرقہ پرستی بھی اس ناول کا موضوع ہے۔برٹش مسلم زرینہ کی کہانی کو ایک عالمی استفہامیئے کی صورت میں پیش کیا ہے۔اس حوالے سے چوتھا ناول یونس جاوید کا ستونت سنگھ کا کالا دن ہے۔سانحہ 9/11 کے بعد پاکستان میں غیر یقینی صورتِ حال اس ناول کا موضوع ہے،جس میں بغیر کسی ثبوت کے کسی بھی شخص کو اٹھا لیا جاتا تھا۔پانچواں ناول سرفراز بیگ کا پس آئینہ ہے۔جس میں سانحہ 9/11 کے بعد مغربی دنیا میں پاکستان کے امیج کو پیش کیا گیا ہے۔چھٹا ناول ایم اختر کا ایک لو سٹوری اور ایک ایٹمی قیامت ہے۔جس کا موضوع جنوبی ایشیاء کا خطہ ہے جہاں پاکستان اور بھارت جیسی دو ایٹمی طاقت موجود ہیں کا مستقبل ہے۔اس ناول کے پلاٹ میں سانحہ 9/11 کے بعد پاکستان کے شہر ایبٹ آباد میں ایک کمپاونڈ جس میں اسامہ بن لادن کی موجودگی کا خدشہ تھا، پر امریکی کمانڈوز کا خفیہ آپریشن بھی شامل ہے۔ آٹھواں ناول مرزا اطہر بیگ کا صفر سے ایک تک ہے۔جس کے پلاٹ میں سانحہ 9/11 کے بعد غیر ملکیوں کا اغوا اور قتل کا موضوع بھی شامل ہے۔

دلچسپ اور اور چونکا دینے والے تخلیقی ناول کے لیے پلاٹ اور تکنیک بہت اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔اس حوالے سے دیکھیں تو قلعہ جنگی اور خس و خاشاک زمانے کا پلاٹ اپنے انداز کا منفرد

پلاٹ ہے جس کے انوکھے پن سے کسی بھی صاحبِ بصیرت نقاد کو انکار نہیں ہوسکتا۔ 9/11 کا سانحہ قلعہ جنگی میں آغاز سے انجام تک پھیلا ہوا ہے۔ قلعہ جنگی میں تہہ خانے اور گھوڑے کی علامت کی مدد سے افغانستان پر امریکی حملے کی داستان بیان کی ہے۔ ناول کا عنوان، تہہ خانہ، گھوڑا، کی علامت کے ذریعے افغانستان کی سیاسی سماجی اور عصری تاریخ کو بیان کیا ہے۔ اسی طرح 9/11 کا سانحہ خس و خاشاک زمانے کے پلاٹ میں شامل ہے۔ جس سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ سانحہ 9/11 کے اثرات ان ناولوں پر پوری طرح مرتب ہوئے ہیں۔ خس و خاشاک زمانے میں استعمال کی گئی تکنیک پر بھی سانحہ 9/11 کے اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ ان علامتوں میں فلیش بیک، بین المتونیت، اُسلوب، عمارتوں کا ایسے گرنا جیسے زمانے خس و خاشاک ہو جاتے ہیں، امریکی بر جیاں، انعام اللہ اور شباہت کا ایک نیا جہاں آباد کرنے کا خواب، ان سب علامتوں پر سانحہ 9/11 کے گہرے اثرات موجود ہیں۔

قلعہ جنگی اور خس خاشاک زمانے کے کرداروں کے شخصی ارتقاء پر بھی سانحہ 9/11 کے واضح اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ قلعہ جنگی کے کرداروں میں اللہ بخش اہم کردار ہے جس کا تعلق پاکستان سے ہے، بچپن میں اپنی نانی اماں کے پاس رہتا تھا۔ جوان ہو کر ایک بونے کے کہنے پر جہاد میں شامل ہوا۔ دوسرا اہم کردار عبدالوہاب خادمین حرمین شریفین کا ہے۔ ان کا تعلق سعودی عرب سے ہے، انہوں نے کیمبرج سے علم الانسان کی ڈگری حاصل کی، لیکن سعودی بادشاہت کے سامنے مُہر بہ لب رہنا، اور صدا اُن کے سامنے جھکنا، اُن کے لیے مشکل تھا۔ اس سے عاری ہو کر وہ جہاد میں شامل ہوا۔ تیسرا کردار مرتضٰی بیگ کا جو چوری چھپے افغانستان آیا تھا۔ ان کا والد بھی سوویت یونین کے دور میں چوری چھپے افغانستان آیا کرتا تھا۔ وہ اپنے والد کے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے آیا تھا۔ مرتضٰی بیگ ایک نائی کے کہنے پر جہاد میں شامل ہوا۔ چوتھا کردار ہاشم میر کا ہے جو جہادی کیمپ میں آنے سے پہلے برطانیہ میں ایک شاندار زندگی گزار رہا تھا، ہاشم میر ایک سعودی لڑکے کے کہنے پر جہاد میں شامل ہوا۔ پانچواں کردار ایک پٹھان گل شیر کا ہے جس کا تعلق پاکستان کے قبائلی علاقے دِیر سے ہے۔ ان کے گھر میں صابن بھی نہ ہوتی تھی، والد ایک نواب کے اصطبل میں کام کرتا تھا۔ ماں نے چند دن کی غربت کو ختم کرنے کے لیے ان کی بہنوں کو بیچ دیا تھا۔ ایک مولوی کے کہنے پر طالبان میں شامل ہوا۔ آخری کردار عبدالحمید جان واکر کا ہے، ان کا تعلق امریکہ سے ہے، طالبان میں شامل ہونے سے پہلے امریکہ میں اپنی گرل فرینڈ کے ساتھ شاندار زندگی بسر کر رہا تھا۔ اچانک کیمونزم کا خلاف ہو جاتا ہے اور اسلام

قبول کر کے طالبان کے ساتھ شامل ہو جاتا ہے۔ یہ ان کرداروں کی سانحہ 9/11 سے پہلے کی زندگی یکسر مختلف تھی لیکن یہ سب مجاہد بن کر افغانستان میں امریکہ سے لڑنے آئے تھے، دوسروں کی سر زمین پر اپنے خواب پورے کرنے آئے تھے۔ اب قلعہ جنگی کے تہہ خانے میں جو پانی اور پٹرول سے بھر دیا تھا، پانی کی سطح پر مردہ حالت میں تیر رہے ہیں۔

خس و خاشاک زمانے کا اہم کردار انعام اللہ ہے جو گرو مانگٹ کی مسجد کی سیڑھیوں میں پڑا ملا۔ امیر بخش اس کی پرورش کرتا ہے۔ بڑا ہو کر صحافی اور نامور ناول نگار بنتا ہے۔ صدر ضیاء الحق کے دور میں ایک اختلافی کالم لکھنے پر کوڑے مارے جاتے ہیں۔ مذہب کی تنگ نظری سے تنگ آکر وہ امریکہ جاتا ہے جہاں پر سانحہ 9//11 کے بعد اُس کو نفرت کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ اس کے بعد وہ کینیڈا ہجرت کر جاتا ہے۔ جہاں پر وہ امریکی برجیوں سے ٹکرا کر اپنے عزتِ نفس کے مجروح ہونے کی تلافی چاہتا ہے، لیکن سانسی کی پوتی شباہت ان کو اس ارادے سے بعض رکھتی ہے اور دونوں شادی کر کے، ایک نیا جہان آباد کرنے کا سوچتے ہیں جہاں پر دھماکوں کی آواز نہ ہو۔

قلعہ جنگی اور خس و خاشاک زمانے میں سیاسی علائم واستعارات کا بھی بہت خوب استعمال کیا گیا ہے۔ قلعہ جنگی کا عنوان بھی ایک علامتی اور استعاراتی ہے جو افغانستان کی مضبوطی اور مزاحمت کو ظاہر کرتا ہے۔ اس کے علاوہ گھوڑے کے علامتی پیکر میں افغانستان کی سیاسی، سماجی، معاشی، عصری اور بحرانی صورتِ حال کا دلکش مرقع پیش کیا ہے۔ اس کے بعد خس و خاشاک زمانے کی پہلی علامت کنواں ہے جس کو پاکستان کی تقسیم کے پس منظر میں پیش کیا ہے۔ بونوں کی علامت ایک مکمل سیاسی استعارہ ہے جو پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد اُن لوگوں کی طرف بلیغ استعارہ ہے جو عام لوگوں کو ذلت سے مار دینے والے ہوتے ہیں۔ بسنت کے علامتی انداز میں ہندوستان کی تقسیم اور خون خرابے کی طرف اشارہ ہے۔ مستنصر حسین تارڑ نے 9/11 کو بھی ایک بلیغ استعارے کے انداز میں پیش کیا ہے کہ تہذیبوں کے تصادم کس طرح شروع ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ نئے آدم کی تلاش بھی ایک وسیع استعارہ ہے جو امن کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ سیاسی علائم واستعارے مستنصر حسین تارڑ کے تخلیقی اظہار کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔

کتابیات

۱۔ احسن فاروقی،ڈاکٹر،ناول کیا ہے،درداکادمی،لاہور،۱۹۶۴ء

۲۔ ارون دھتی رائے،سرمایہ داریت ریاستی جبر اور مزاحمت،مترجم،امجد نذیر،ملتان،سن،۲۰۱۲ء

۳۔ اشرف کمال،محمد،ڈاکٹر،تنقیدی تھیوری اور اصطلاحات،مثال پبلشرز،فیصل آباد،سن،۲۰۱۶ء

۴۔ ایم اختر،ایک لو سٹوری اور ایک ایٹمی قیامت،فکشن ہاوس،لاہور،سن،۲۰۱۶ء

۵۔ اے،آر،شبلی،پاکستان کے دیہہ خدا،آتش فشاں،لاہور،سن،۲۰۰۹ء

۶۔ پرویز مشرف،جنرل،(ر)سب سے پہلے پاکستان،فیروز سنز،لاہور،۲۰۰۶ء

۷۔ ثروت جمال اصمعی،دھشت گردی اور مسلمان،انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی،اسلام آباد،سن،۲۰۰۸ء

۸۔ جان کے کولی،غیر مقدس جنگیں،مترجم،فرخ سہیل گوئندی،جمہوری پبلی کیشنز،لاہور،سن،۲۰۱۲ء

۹۔ حمید شاہد،مرگ زار،اکادمی بازیافت،کراچی،سن،۲۰۰۴ء

۱۰۔ خالد جاوید،کہانی،موت اور آخری بدیسی زبان،ایجوکیشنل ہاوس،دہلی،سن،۲۰۰۸ء

۱۱۔ ذی شان ساحل،جنگ کے دنوں میں،آج،کراچی،سن،۲۰۰۳ء

۱۲۔ سٹیفن پی کوہن،پاکستان کا مستقبل،مترجم،ہما انور،جمہوری پبلشرز،لاہور،۲۰۱۱ء

۱۳۔ سرفراز بیگ،پسِ آئینہ،مثال پبلشرز،فیصل آباد،سن،۲۰۱۳ء

۱۴۔ سلیم اختر،ڈاکٹر،تنقیدی اصطلاحات:توضیحی لُغت،سنگِ میل پبلی کیشنز،لاہور،سن،۲۰۱۱ء

۱۵۔ صاحبزادہ حمید اللہ،فن اور تکنیک،سنگِ میل پبلی کیشنز،لاہور،۱۹۹۰ء

۱۶۔ فرانسز فوکویاما،مترجم،نورالدین انور،تاریخ کا خاتمہ،سٹی بک پوئنٹ،سن،۲۰۱۳ء

۱۷۔ ماریو برگس یوسا،نو جوان ناول نگار کے نام خط،مترجم:محمد عمر میمن،شہرزاد،کراچی،سن،۲۰۱۰ء

۱۸۔ مبشر حسن،شاھراہِ انقلاب،جلد دوئم،شناخت پبلشرز،لاہور،سن،۲۰۱۲ء

۱۹۔ مجاہد کامران،ڈاکٹر،پسِ پردہ :عالمی سیاست کے مخفی حقائق،سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور،سن،۲۰۱۱ء

۲۰۔ مجاہد کامران،پرفیسر،ڈاکٹر،*9/11&new world order*،سانحہ ستمبر اور نیا عالمی نظام،مترجم: پروفیسر،ظفر الحسن پیرزادہ،یونیورسٹی آف دی پنجاب،لاہور،سن،۲۰۱۴ء

۲۱۔ محسنہ جیلانی،میں دہشت گرد ہوں؟شہرزاد،کراچی،سن،۲۰۰۸ء

۲۲۔ محسنہ جیلانی،بکھرے ہوئے لوگ،اکادمی بازیافت،کراچی،سن،۲۰۰۳ء

۲۳۔ مرزااطہر بیگ،صفر سے ایک تک،سانجھ،لاہور،سن،۲۰۰۹ء

۲۴۔ مستنصر حسین تارڑ،خس وخاشاک زمانے،سنگِ میل پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۱۰ء

۲۵۔ مستنصر حسین،تارڑ،قلعہ جنگی،سنگِ میل پبلی کیشنز،لاہور،سن،۲۰۰۸ء

۲۶۔ مشرف عالم ذوقی،سلسلہ روز و شب:اردو ناولوں کا خصوصی مطالعہ اور دیگر مضامین،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس،دہلی،سن،۲۰۱۴ء

۲۷۔ ممتاز احمد خان،ڈاکٹر،اردو ناول کے ہمہ گیر سروکار،ماجرائے پبلی کیشنز،کراچی،۲۰۰۸

۲۸۔ ممتاز احمد خان،ڈاکٹر،اردو ناول کے چند اہم زاویے،انجمن ترقی اردو پاکستان،کراچی،۲۰۰۳ء

۲۹۔ ممتاز شیریں،معیار،نیا ادارہ،سویرا آرٹ پریس،لاہور،سن،۱۹۶۳ء،ص۱۶

۳۰۔ نجیبہ عارف،9/11اور پاکستانی اردو افسانہ(مرتب)پورب اکادمی،اسلام آباد،سن،۲۰۱۱ء

۳۱۔ نوم چومسکی،گیارہ ستمبر،مترجم:سید کاسف رضا،شہرزاد،کراچی،سن،۲۰۰۴ء

۳۲۔ یونس جاوید،ستونت سنگھ کا کالا دن،سنگِ میل پبلی کیشنز،لاہور،سن،۲۰۱۴ء،ص،۲۱

رسائل

۱۔ فنون،شمارہ نمبر 119،جنوری تا اپریل ۲۰۰۳ء،مدیر،احمد ندیم قاسمی،لاہور

۲۔ تسطیر،شمارہ نمبر،19,20,21,22،اکتوبر ۲۰۰۱ تا مارچ ۲۰۰۲ء،مدیر،نصیر احمد ناصر،لاہور،

۳۔ دنیا زاد،شمارہ،جولائی ۲۰۰۸ء،مدیر،آصف فرخی،کراچی،

۴۔ چہارسُو،مارچ،اپریل،۲۰۱۵ء